لہ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

اس شمارہ میں

جلد نمبر ۲ — شمارہ نمبر ۸ — محرم الحرام ۱۳۸۷ھ — مئی ۱۹۶۷ء

زر سالانہ چھ روپے — فی پرچہ ۵۰ پیسے — غیر ممالک سالانہ ۱۶ شلنگ

سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ طابع وناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر
دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پچھلے دنوں برمنگھم یونیورسٹی (برطانیہ) کے شعبۂ علومِ اسلامیہ کے پروفیسر مستشرق جان ٹیلر نے بھارت کے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تقریر کے دوران برطانیہ کی مسلم اقلیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا اور کہا کہ — "درحقیقت اس وقت دنیا میں آسمانی دین کی پیروی اور اللہ تعالےٰ کی عبادت کا دعویٰ کرنے والی دونوں قومیں مسلمان اور عیسائی مادیت اور دہریت کی گود میں جانے والوں کی بہ نسبت اقلیت میں ہیں۔ دونوں کو مادیت اور ظاہر پرستی کا سامنا ہے۔ اور منکرِ خدا اقوام اس اقلیت کو اپنے اندر مدغم کرنے پر تلی ہوئی ہیں" (البعث الاسلامی لکھنؤ عربی مجلّہ)

پروفیسر صاحب موصوف کی بات اس حد تک معقول ہے کہ موجودہ حیوانی تہذیب و تمدن جس کی بنیاد سراسر مادی مفادات، خواہشات کی تکمیل جلبِ منفعت، زرپرستی، حصولِ دولت، معاشی افکار اور اقتصادی فلسفوں پر ہے، اس کا وار کسی خاص مذہب اور کسی ایک دین پر نہیں۔ دہریت اور نفس پرستی کا یہ عفریت ہر اس نظریہ، دین، علم و حقیقت، ادراک و معرفت کو چیلنج کر رہا ہے، جس کا تعلق روح، آخرت، سچائی و صداقت، معنوی اقدار یا کسی بھی مابعد الطبعیاتی عقیدہ سے ہو کہ موجودہ تہذیب کا خمیر ہی جسم و مادہ اور نفعِ عاجل، لذت پرستی اور استیلاء و استبداد سے اٹھایا گیا ہے، معنوی اقدار، روحانی صفات اور انسان کے باہمی روابط و علائق سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ تبتغون عرض الحیوۃ الدنیا واللہ یرید الآخرۃ۔

مگر سوال یہ ہے کہ خدا اور خود فراموش تہذیب جس نے آج انسان کو جامد و بے حس حیوان اور جسم پروری کی ایک مشین بنا کر رکھ دیا ہے — اس تہذیب نے جنم لیا کہاں سے؟ کس نے اس شجرۂ خبیثہ کو پروان چڑھایا؟ عیسائیت کا علمبردار یورپ اور دیگر صلیبی اقوام علی الخصوص برطانیہ کے علاوہ اور کون تھا جس نے انسانیت کو موت کے چوراہے پر لا کھڑا کیا۔ جس نے رنگ و بو، خواہش اور شہوات کی ایک نظر فریب جنت بسائی، جس نے بالشت بھر پیٹ اور معدہ سے ساری کائنات کو ناپا، اور جس نے لا الٰہ الا المعدۃ والمادۃ کے بلند بانگ نعروں سے خدا کے وجود اور تمام غیبی حقائق سے انکار کیا۔ وہ عیسائیوں کا مکروہ کلیسائی نظام اور دشمنِ فطرت اصول ہی تھے، جنہوں نے عقل و دانش کو مذہب سے بغاوت پہ آمادہ کیا۔ وہ یورپ ہی تو تھا جس نے اپنے علم و ادراک کی اساس حواس اور مشاہدات پر رکھی۔ جس کا منطقی اور طبعی نتیجہ یہی ظاہر ہوا

کہ وہ تمام مابعد الطبیعی حقائق خدا و رسول، روح و آخرت، بعث بعد الموت اور حساب و کتاب مفروضہ اور من گھڑت افسانے معلوم ہونے لگے، جو عقل و حواس کی گرفت میں نہ آسکے۔ نتیجۃً دنیا مادیت کے جنگل میں چلی گئی اور مذہب سے محروم ہو کر منکرِ خدا اقوام اطمینان و سکون سے عاری زندگی کی جلتی بھٹی میں کودتی چلی گئیں۔ آخر یہ آگ سلگائی کس نے ہے، جس کے سوز و تپش سے آج یورپ کے دانشور نالاں ہیں۔ یہ حالات پچھلی چند صدیوں میں یورپ ہی کے مذہب بیزاری سے پیدا ہوئے ہیں جس نے پہلے اپنے مذہب کا حلیہ بگاڑ دیا، اسے اپنے حیوانی مقاصد کا آلۂ کار بنایا۔ آسمانی تعلیمات سے مسیحیت کا رشتہ کاٹ کر رومی و یونانی تہذیب کے ملبہ سے اس کی عمارت اٹھائی، اس میں بت پرستی کی آمیزش کی، رہبانیت کے نام سے زندگی سے فرار کی راہ اختیار کی، پھر جبر و استبداد اور استعماری عزائم کے سہارے اس خدا بیزار تہذیب کو دیگر اقوام و مذاہب پر ٹھونسنے کی کوشش کی اور اس طرح خدا کی زمین کو ہر قسم درندگی و بربریت اور شر و فساد سے بھر دیا —— آج پروفیسر جان ٹیلر صاحب مادیت اور دہریت کا رونا رو رہے ہیں۔ اگر یہ آنسو مگر مچھ کے آنسو نہیں ہیں تو یہ تلخ حقیقت کیوں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ اس تمام حیوانیت اور مذہب بیزاری کا سہرا تو یورپ کے مسیحیوں کے سر ہے۔

ع باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

یہاں ہم اتنا مزید عرض کئے دیتے ہیں کہ اس وقت مادیت اور ظاہر پرستی کے چیلنج کو صرف اسلام ہی قبول کر سکتا ہے جس میں طلبِ معاش، حصولِ رزق اور کسبِ حلال کی گنجائش تو ہے، مگر خدا فراموشی کی نہیں، جہانبانی اور جہانگیری ہے مگر ظلم و استبداد نہیں، حصولِ منفعت کا حق ہے مگر حق تلفی اور خود غرضی کا نہیں۔ دشمن سے مقابلہ ہے مگر عیاری نہیں۔ دنیا ہے مگر دین سے بغاوت نہیں۔ ربانیت ہے مگر رہبانیت نہیں، علم و معرفت ہے مگر جمود و تعصب نہیں۔ نعمتوں اور لذتوں سے لذت اندوزی ہے مگر اباحیت اور انارکی نہیں —— عیسائیت تو اس وقت اپنا دم توڑ چکی تھی جبکہ خدا نے انسانی ہدایت کے لئے آخری روشنی بھیجی۔ قرونِ وسطیٰ کا غیر متمدن اور بیسویں صدی کا ترقی یافتہ یورپ تو علم و تحقیق کے نام پر کتبِ مقدسہ میں الحاق و تحریف اور دشمنِ فطرت خود ساختہ مسیحی اصول کے ذریعہ اس تابوت میں آخری کیل ٹھونک چکا ہے —— مسیحیت، دین و مذہب اور علم اور معرفت کے ہر معرکہ میں شکست کھا چکی ہے، تو مادیت کے میدان میں کیا سنبھل سکے گی۔ عصرِ حاضر کی انسانیت آج جس خلاء کا شکار ہے، یہ خلاء صرف اور صرف اسلام ہی سے پُر ہو سکتا ہے کہ موجودہ بے چینی، اضطراب درد و تڑپ، پریشانی اور تشنگی کا مداوا صرف اسلام ہی ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام —

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ـــــــ اور انشاء اللہ دیر یا سویر اسلام ہی ہوگا جو مادہ پرست اکثریت کو اپنے اندر جذب کرکے رہے گا۔ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون ۔ مخبر صادق و مصدوق علیہ السلام نے فرمایا جسے حضرت مقداد نے نقل کیا۔ لا یبقیٰ علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز وذل ذلیل اما یعزھم اللہ فیجعلھم من اہلہا او یذلھم فیدینون لہا۔ مقداد نے آخر میں فرمایا فیکون الدین کلہ للہ (رواہ احمد)

اسلامی مشاورتی کونسل نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ ملک میں موجودہ قانونِ وراثت کی بجائے اسلامی قانونِ وراثت نافذ کیا جائے۔ اور مرتد ہونے والے مسلمانوں کو آبائی جائداد سے محروم کر دیا جائے، اور اسلامی احکام کے مطابق انہیں موت کی سزا دی جائے۔ کونسل نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ملک میں ایسے منظم افراد یا اداروں کا فوری محاسبہ کرکے انہیں سخت ترین سزائیں دی جائیں جو مسلمانوں کو مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعہ مرتد بنانے میں مصروف ہیں۔ کونسل نے اپنی سفارشات میں جو صدر مملکت کو پیش کر دی گئی ہیں اس امر پر اظہارِ تشویش کیا ہے، کہ ملک میں منظم طور پر مسلمانوں کو غیر مسلم بنانے کا کام جاری ہے جس کا محاسبہ نہیں کیا جا رہا۔ حالانکہ اسلام میں مرتد بنانے والے بھی قابلِ تعزیر ہیں۔ کونسل نے یہ بھی کہا کہ ایک اسلامی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے درمیان اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ جہاں تک سفارشات کا تعلق ہے، تمام اسلام پسند حلقے اس کی تحسین و تائید کریں گے۔ خدا کرے حکومت ان سفارشات کو عملی جامہ بھی پہنا سکے کہ اب تک اس قسم کے مشورے "سفارشات" سے زیادہ مقام نہیں پا سکے۔ اگر اس ضمن میں کونسل نے ارتداد کے واضح مفہوم اور دوٹوک حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہوتی تو اچھا ہوتا کہ جب تک مرتد کو مرتد نہ مانا جائے اُسے سزا کب دی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک میں وسیع پیمانے پر ارتداد کا کام جاری ہے ہماری افرادی قوت عیسائیت اور قادیانیت کی گود میں جا رہی ہے۔ کونسل جیسے ذمہ دار ادارہ کو ایسے تمام "منظم اور غیر منظم افراد اور اداروں" سے بھی پردہ اٹھانا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کو تنبیہ ہو جاتی اور "سفارشات" کا کوئی ثمرہ تو نکل آتا۔ کونسل کی سفارشات میں اسلامی قانونِ وراثت رائج کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اس ضمن میں وضاحت طلب امر یہ ہے، کہ کونسل سے مراد ان قوانین سے امتِ مسلمہ کے متوارث اور قطعی قوانین ہیں یا وہ "اصلاح یافتہ" قوانین جن میں پوتے کی وراثت جیسی دفعات بھی شامل ہیں جن کیلئے پوری اسلامی تاریخ میں کوئی سند اور نظیر نہیں ملتی۔ اگر معاملہ دوسرا ہے تو جس طرح رائج الوقت قانون بقول کونسل کے قرآن و سنت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا، اس طرح اسلامی قوانین کے ترمیم شدہ ایڈیشن سے بھی خرابی دور نہ ہوگی۔ معاملہ سلجھے گا نہیں، بگڑتا چلا جائے گا، کہ

انسانی حالات اور تقاضوں کا سب سے زیادہ جاننے والا اس کا خالق ہی ہے۔ تلک حدود اللّٰہ فلا تعتدوھا ومن یتعدّ حدود اللّٰہ فاولٰئک ھم الظالمون۔

سعودی عرب سے واپسی پر کئی ثقہ حجاج نے یہ افسوسناک انکشاف کیا کہ اس سال کئی قادیانیوں کو حرمین الشریفین میں داخلہ اور مناسک حج کی ادائیگی میں شرکت کا موقعہ دیا گیا۔ اس سے زیادہ لرزہ خیز یہ خبر ہے کہ مرزائیوں کے عالمی مبلغ اور صفِ اوّل کے قائد ظفراللہ خان بھی سرزمین حجاز اور مسلمانوں کے اس روحانی اور عالمی اجتماع میں گھومتے پھرتے رہے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ ہسپتالوں میں کئی ایک قادیانی ڈاکٹر کام کر رہے ہیں۔ ان اطلاعات کے عواقب اور نتائج کے تصور سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا اب کعبۃ اللہ اور جوارِ رسول علیہ السلام بھی اُن شرمناک ریشہ دوانیوں، سازشوں اور ارتدادی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن جائیں گے؟ جس کا مظاہرہ قادیانی جماعت ملک و بیرونِ ملک میں شب و روز کر رہی ہے۔ سرزمین طیبہ میں روضۂ اطہر کی چوکھٹ سے مسلمانوں کو ہٹانے کی کوششیں۔؟ معاذ اللہ والی اللہ المشتکی ۔۔۔۔۔۔
عہدِ نبوت سے لیکر اب تک مسلمان اس معاملے میں بڑے حساس رہے ہیں۔ حرمین الشریفین میں یہود و نصاریٰ اور غیر مسلم اقوام کے داخلے پر پابندی رہی۔ حضور علیہ السلام نے مرضِ وفات میں جزیرۃ العرب کو یہود و نصاریٰ سے پاک رکھنے کا فرمان جاری کر کے معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کا احساس دلایا۔ اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب۔ (الحدیث) کہ عالم اسلام کا منبع اور مسلمانوں کا دل (حرمین الشریفین) غیر مسلموں کی فتنہ پردازیوں کا شکار نہ ہونے پائے کہ دل کے متاثر ہونے سے سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔
موجودہ حکمران ملک فیصل کے پیشرو شاہ سعود کے عہد تک اس معاملہ میں نہایت احتیاط برتی گئی۔ کچھ عرصہ قبل چند قادیانی خفیہ طور پر داخل ہوئے انہیں فوراً پکڑ پکڑ کر نکال دیا گیا۔ موجودہ حکومت سے اس مسئلہ میں غفلت ہوئی یا دیدہ و دانستہ اُس روشن خیالی اور ترقی پسندی کی وجہ سے ایسا کیا گیا جس کے ایمان سوز اثرات نے آج حرمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ معاملہ ہر حال میں نظرثانی اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ بلاشبہ موجودہ سعودی حکومت حجاج کے آرام و راحت میں کوئی کسر نہیں اٹھاتی، تمام ممکنہ اصلاحات کر رہی ہے، جس پر وہ پورے عالم اسلام کی طرف سے شکریہ و تحسین کی مستحق ہے ۔۔ مگر یاد رہے کہ عالمِ اسلام کیلئے حجاز کی اصل دولت اور سرمایہ وہاں کی معنوی برکات اور روحانی اثرات ہیں۔ مسلمان خدا فراموش مادیت اور زندگی کے ہنگاموں سے گھبرا کر اُس آستانہ عافیت اور مرکزِ سکون کی طرف لپکتے ہیں۔ اگر روئے زمین پر خدا کی اس ایک ہی روشنی کے گرد بھی مادیت کا حصار کھچا جاتا ہے،

عصرِ جدید کی نام نہاد ترقیات سے وہاں کا تقدس آفریں نورانی ماحول بدلا جاتا ہے۔ یورپی تہذیب و تمدن آزادی اور فحاشی ؛ مغربی تعیش و ترفہ کی کھلی چھوٹ دی جاتی ہے، اور تو اور مسلمانوں کے دین و ایمان کے دشمن یہود و نصاریٰ ہنود اور قادیانیوں کو وہاں آنے جانے کی اجازت دی جاتی ہے تو یہ پورے عالمِ اسلام کے ساتھ ناانصافی ہوگی کہ حرمین الشریفین تمام مسلمانوں کے مشترکہ متاع ہیں۔ اور خدا کے گھر میں دین و ایمان کے ڈاکوؤں کے نقب لگانے پر کوئی مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ بدقسمتی سے ہماری حکومت قادیانیوں کے پاسپورٹ پر غیر مسلم یا قادیانی ہونے کی مہر نہیں لگاتی —— اور سعودی عرب کے بعض ذمہ دار حضرات کا یہ عذر معقول ہوتا اگر انہوں نے کم از کم ظفر اللہ خان کو روک دیا ہوتا کہ اسکی مرزائیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ یہ دشواری پچھلی حکومتوں میں بھی پیش آئی ہوگی، پھر بھی انہوں نے تفتیش اور تحقیق کرتے ہوئے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا، اور اگر کسی طرح معلوم ہوا کہ دھوکہ اور فریب سے ایسا کوئی قادیانی داخل ہوا ہے تو اُسے اُسی وقت نکال باہر کیا —— سعودی عرب کے موجودہ حساس اور بیدار مغز حکمران شاہ فیصل سے ہماری مخلصانہ التجا ہے کہ وہ ان امور میں اپنے خاندانی اور روایتی دینی تصلب کو برقرار رکھتے ہوئے حرمین کے معاملہ میں دنیا بھر کے نام لیوایانِ محمد علیہ السلام (بآبائنا وامہاتنا) کے احساسات کا خیال رکھیں، یہ ناموسِ محمدی کا سوال ہے جو آپ اور ہم سب کا مشترکہ معاملہ ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اور ناگفتہ بہ اور نامناسب منکرات اور خرابیوں کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو مشاہدات پر مبنی ہیں، مگر ہم آج صرف ناموسِ محمدی علیہ السلام اور تقدسِ حرمین کے نام پر مرزائیوں کے معاملہ میں نظرِ ثانی کی درخواست کرتے ہیں ۔۔

اندکے پیشِ تو گفتم غمِ دل ترسیدم ۔۔۔ کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ——

سمیع الحق

مدینہ طیبہ کی اطلاعات سے وہاں کے مشہور صاحبِ مسند و ارشاد بزرگ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدظلہ مہاجر مدینہ طیبہ کی علالت کا علم ہوا۔ حضرت شیخ کی ذات اس وقت مسلمانوں اور خاص طور سے پاکستانی مسلمانوں کے لئے فیض و برکت کا سرچشمہ ہے۔ اور پاکستان سے تو ان کا وطنی رشتہ ہے۔ اہل علم اور عام مسلمانوں سے حضرت مولانا مدظلہ کی صحت کاملہ کیلئے دعاؤں کی درخواست ہے۔ بحمد اللہ کہ حضرت مولانا مدظلہ کے تازہ مکتوب بنام حضرت شیخ الحدیث صاحب سے معلوم ہوا کہ اب انکی صحت رو بہ افاقہ ہے۔ قارئین اور تمام مسلمانوں سے دعائے صحت فرمانے کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

سیدنا حضرت معاویہؓ پر عمرانی معاہدہ توڑنے کا الزام

دیہی ترقیاتی اکیڈمی پشاور کا سیمنار

ملک وملت کی دینی اور دنیوی خدمت کرنے والوں میں اتفاق و اتحاد اور یک جہتی و یگانگت پیدا کرنے والی کوششوں کو کون ذی ہوش ہوگا جو پسند نہ کرے گا۔ بلکہ عقلاً اس کو ضروری اور مذہباً فرض نہیں سمجھے گا، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ سرکاری یا نیم سرکاری طور پر اس سلسلہ میں عام طور پر جو بھی قدم اٹھایا جاتا ہے، الاماشاء اللہ وہ دانستہ یا نادانستہ نتیجہ کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ مایوس کن ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات زیادہ افتراق اور دوری کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مگر اس وقت ہم دیہی ترقی اکیڈمی پشاور کی جانب سے علماء کے سیمنار کے نام سے اجتماعات پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اکیڈمی کے ایک ذمہ دار افسر کی جانب پہلے ہی اجلاس کی پہلی ہی تقریر میں اخبارات نے جو مضمون منسوب کیا ہے، اس میں اور کئی قابل اعتراض کلمات کے علاوہ "عمرانی معاہدہ" کے توڑنے کی ذمہ داری خال المسلمین کاتب وحی سیدنا امیر معاویہؓ کے سر پہ ڈالی گئی ہے اور اسطرح انہیں مسلمانوں اور مسلمان ملکتوں کی پسماندگی کا پہلا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اگر اخبارات کی یہ نسبت صحیح ہے، تو نہ صرف یہ کہ یہ ایک بہت بڑا تاریخی جھوٹ اور سیدنا امیر معاویہؓ سے عقیدت ومحبت رکھنے والے کروڑوں پاکستانیوں کی روحانی اذیت کا باعث ہے۔ بلکہ ملک کی غالب ترین اکثریت اہل سنت والجماعت کے ایمانی جذبات کو کھلا چیلنج بھی ہے۔

اخبارات میں شائع شدہ اس تقریر یا خطبۂ استقبالیہ کے متن کے مطابق دیہی ترقی اکیڈمی کے ڈائریکٹر صاحب کے نزدیک عمرانی معاہدہ نام ہے اس کا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء اور دولت مندوں سے عہد لیا کہ وہ خیرات اور صدقات سے غرباء کی امداد کریں گے اور غرباء سے عہد لیا تھا کہ وہ چوری اور ڈکیتی وغیرہ نہیں کریں گے۔ ڈائریکٹر صاحب کے نزدیک مسلمان اور مسلمان ملکتوں کی پسماندگی

کا واحد ذریعہ اس معاہدہ کو چھوڑ دینا ہے۔ وہ کہتا ہے:

بالآخر جب معاویہؓ نے ایسا انتظام کر دیا کہ معاہدہ عمرانی اسلام کی پابندی سے پہلا فریق "امراء" آزاد ہو گیا یعنی صدقات وغیرہ کی آیات جو خصوصاً ان کے لئے تھیں اختیاری قرار دیدی گئیں ان پر عمل نہ کرنے پر کوئی تعزیر نہ لگائی گئی اور اس کے برعکس دوسرے فریق معاہدہ یعنی غرباء کے عہد کو لازمی شکل دے کر ناقابل معافی قرار دیا گیا اور ہاتھ کاٹنے کی سزا انہیں دی گئی تو اس صورت حال میں معاہدہ عمرانی کا ایک فریق امراء تو اپنا معاہدہ پورا کرنے کا پابند نہ رہا اور دوسرے فریق غرباء کو اس معاہدہ پر بالجبر پابند کیا گیا۔ ان حالات میں معاہدہ عمرانی اسلام ٹوٹ گیا اور اسکی اصلی شکل بدل گئی ——— (شہباز پشاور۔ ۱۱ اپریل ۱۹۶۷ء)

مسلمانوں کی پسماندگی اور مسلمان مملکتوں کے زوال کا واحد ذریعہ عمرانی معاہدہ کا ٹوٹ جانا ہے۔ یا اس میں بقیہ عبادات کے چھوڑ دینے، معاملات خرید و فروخت میں بیع مکروہ بیع فاسد اور قمار و ربوا سود تک سے احتراز نہ کرنے بلکہ اس کو گھر گھر تک پہنچا دینے کی سعی نامشکور کرنے فصل خصومات عدالتوں میں کھلم کھلا ملم یحکم بما انزل اللہ کے مصداق بننے اور قوانین کفر کو جاری کرنے یہود و نصاریٰ کی صورت اور سیرت بنانے وغیرہ وغیرہ کو بھی دخل ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے، اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر صرف عمرانی معاہدہ ہی کا ٹوٹ جانا مسلمانوں کی پسماندگی کا واحد ذریعہ ہے تو کیا واقعی اسکی ذمہ داری سیدنا حضرت امیر معاویہؓ پر ہے۔

ہمیں یہ تبلایا جائے کہ کس مستند تاریخ کے کونسے باب میں یہ لکھا گیا ہے، کہ امیر معاویہؓ نے فلاں خطبہ یا فلاں سرکاری مراسلہ میں یہ فرمایا تھا۔ کہ آتو الزکوٰۃ کا حکم اختیاری ہے۔ اس پر مسلمان عمل کریں یا نہ کریں، ہر طرح ان کا اختیار ہے۔

اور یا پھر اموال تجارت یا مواشی و دیگر اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ اور عشر وغیرہ وصول کرنے کا جو انتظام خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کیا تھا۔ امیر معاویہؓ نے اس کے خلاف قدم اٹھایا۔ صدیق اکبرؓ نے جن مانعین زکوٰۃ سے جہاد فرمایا تھا وہ یا تو زکوٰۃ کی فرضیت کا انحصار کر کے ارتداد کے مرتکب ہوئے تھے، جیسا کہ واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، اور یا اموال ظاہرہ کا زکوٰۃ بیت المال کو سپرد کرنے سے انکار کرتے ہوئے بغاوت اختیار کر گئے تھے جس پر واللہ لومنعوا فی عناقا وفی روایۃ عقالا۔ اس پر دال ہے۔ ہمیں تبلایا جائے کہ امیر المومنین سیدنا امیر معاویہؓ کے دور امارت میں کس قوم نے کب زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا تھا اور حضرت امیر معاویہؓ نے خلیفہ اوّلؓ

کے طریق کے برخلاف ان کو آزاد چھوڑ دیا تھا یا کب اور کس قوم نے اموالِ تجارت اور اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ شرعی حکم برخلاف بیت المال کو سپرد کر دینے سے انکار کر کے بغاوت کا ارتکاب کیا تھا۔ اور امیر المؤمنین معاویہؓ نے ان کو معاف کر دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو فرضیت زکوٰۃ کے منکر کو حضرت معاویہؓ نے مسلمان سمجھا ہے۔ اور نہ ہی اموالِ تجارت یا اموال ظاہرہ کے ادا کرنے میں شرعی حکم کی پابندی سے حضرت معاویہؓ نے رعیت کو آزاد چھوڑا ہے ——— دیہی ترقی کی آڑ اور علماء سے ہمدردی کے پردہ میں سَبّ معاویہؓ کا شوق پورا کرنا تھا سو پورا کیا گیا۔ فالی اللہ المشتکیٰ ——— "سیمنار میں شرکت فرمانے والے بزرگوں سے" ہم ان دو سو ائمہ مساجد اور علماء سے جن کی سیمنار میں شرکت کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ بحق اسلام یہ دریافت کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ کیا ان کا عقیدہ بھی یہی ہے، کہ معاہدہ عمرانی باصطلاح ڈائریکٹر صاحب کے توڑنے کی ذمہ داری واقعی سیدنا امیر معاویہؓ کے سر پر ہے۔

اور کیا آپ کے نزدیک بھی مسلمانوں اور مسلمان مملکتوں کی پسماندگی کا ذمہ دار امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور کیا واقعی آپ یہ یقین رکھتے ہیں کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے امراء کی طرفداری کی اور ان کو آیات صدقات پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیدیا تھا۔

اور کیا واقعی آپ یہی ایمان رکھتے ہیں کہ جب امراء نے صدقات وغیرہ کے آیات پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا، تو اب غرباء چوری اور ڈکیتی کرنے سے مجرم نہ ٹھہرے۔

اور کیا آپ کا مذہب یہی ہے کہ جب امراء نے اپنا فریضہ ادا کرنا چھوڑ دیا تو اب غرباء پر چوری وغیرہ کا شرعی حد قطع ید وغیرہ جاری کرنا   اور کیا چوری ڈکیتی نہ کرنے کا عہد صرف غرباء ہی سے لیا گیا تھا۔ اور کیا دنیا میں چوری صرف غریب ہی کرتا ہے۔

علماء کو نصیحت :- ۹ انجام پشاور ۱۳ر اپریل ۱۹۶۷ء کا کہنا ہے کہ ایک بزرگ نے علماء کی ہمدردی کرتے ہوئے انہیں نصیحت فرمائی کہ ——— "علماء سائنس سے تعصب کرنا چھوڑ دیں"۔

اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علماء نت نئی ایجادات کو از روئے شرع ناجائز نہ کہیں۔ ہم ہوائی جہاز بنائیں تو اس پر اعتراض نہ کریں۔ چاند اور سورج پر پہنچنے کے انتظامات کریں "روس اور امریکہ کا مقابلہ کرتے ہوئے" ٹینک بنائیں۔ بم اور ایٹم بم کا کارخانہ کھولیں یا اور کوئی نیا انکشاف کریں تو اس میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اگر یہی معنی مراد ہیں تو انہیں ثابت کرنا چاہئے کہ علماء نے کب اس قسم کا تعصب کیا تھا اور کس مستند عالم نے کس کتاب میں یہ لکھا ہے، کہ پانی سے بجلی نکالنا حرام ہے۔ فون لگانا ناجائز

ہے، ریڈیو کی صنعت میں کام کرنا کفر ہے۔ ائیرکنڈیشنز اور ریفریجریٹر کا استعمال غلط ہے۔ اور ہوائی جہاز اور راکٹ و میزائلز کا کارخانہ کھولنا از روئے شرع ممنوع ہے۔ اس گونہ تعصب کا الزام علماء پر سراسر تہمت اور افتراء ہے، اور اس غیر واقعی الزام کو بار بار دہرانا ملک و ملت کی کوئی خدمت نہیں بلکہ ملک کی دینی اور دنیوی خدمت کرنے والوں کے درمیان افتراق کو ہوا دینا ہے۔

سائنس اور مذہب کا موضوع ہی الگ الگ ہے، سائنس کا میدان طبعی اور ریاضی ہے جبکہ مذہب کا موضوع علم الٰہی، تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ ہے۔ ان میں تصادم اور ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں اگر ناصح مشفق کا مقصد اس نصیحت سے یہ ہے کہ علماء ان چیزوں کو مختلف صورتوں میں استعمال پر بھی جائز و ناجائز کا سوال نہ اٹھائیں جسطرح کہ وہ فون بنانے اور لگوانے پر معترض نہیں ایسا ہی وہ فون کو شہادت پر بھی استعمال کرنے پر اعتراض نہ کریں۔ فونی اطلاع کو نماز و روزہ کے دارو مدار بنانے پر بھی خاموش رہیں۔ فون کے ذریعہ ایجاب و قبول کو بھی تسلیم کریں۔

اور جیسا کہ ریڈیو بنانے پر علماء کو اعتراض نہیں، ایسا ہی اس کے ذریعہ گانا بجانا فحش اور بے حیائی کی اشاعت سے بھی تعصب نہ کریں۔

اور جیسا کہ یہ علماء پانی سے بجلی نکالنے اور ان سے روشنی لینے پر چراغ پا نہیں ہوتے ایسا ہی اس کے ذریعہ ذبح کرنے کو عین شرعی ذبح قرار دیں۔ وغیر ذالک۔

تو معاف رکھیں یہ علماء کا سائنس سے تعصب نہیں بلکہ آپ کا دین سے پیچھا چھڑانا ہے جس سے جب تک اسلام کا دعویٰ کیا جائے گا۔ آزاد ہونا ناممکن ہے ــــــ ارشاد خداوندی ہے، وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ و رسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالا مبینا ــــــ

مولانا الیاس صاحبؒ نے ایک مرتبہ اس سوال پر کلام کرتے ہوئے کہ "مسلمانوں کو حکومت و اقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا" فرمایا "اللہ کے احکام اور امر و نواہی کی حفاظت و رعایت جب تم اپنی ذات اور اپنی گھریلو زندگی میں نہیں کر رہے ہو۔ (جس پر تمہیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے) تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالہ کر دیا جائے۔ ایمان والوں کو حکومت ارضی دینے سے تو منشاء الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اور اس کے احکام کو دنیا میں نافذ کریں۔ تو تم جب اپنے حدود اختیار میں یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمہارے سپرد کر کے کل کیلئے تم سے اسکی کیا امید کی جا سکتی ہے۔"

از حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند

ایک غیر مطبوعہ خط

بنام مولانا عبدالاحد - زربی (مردان)
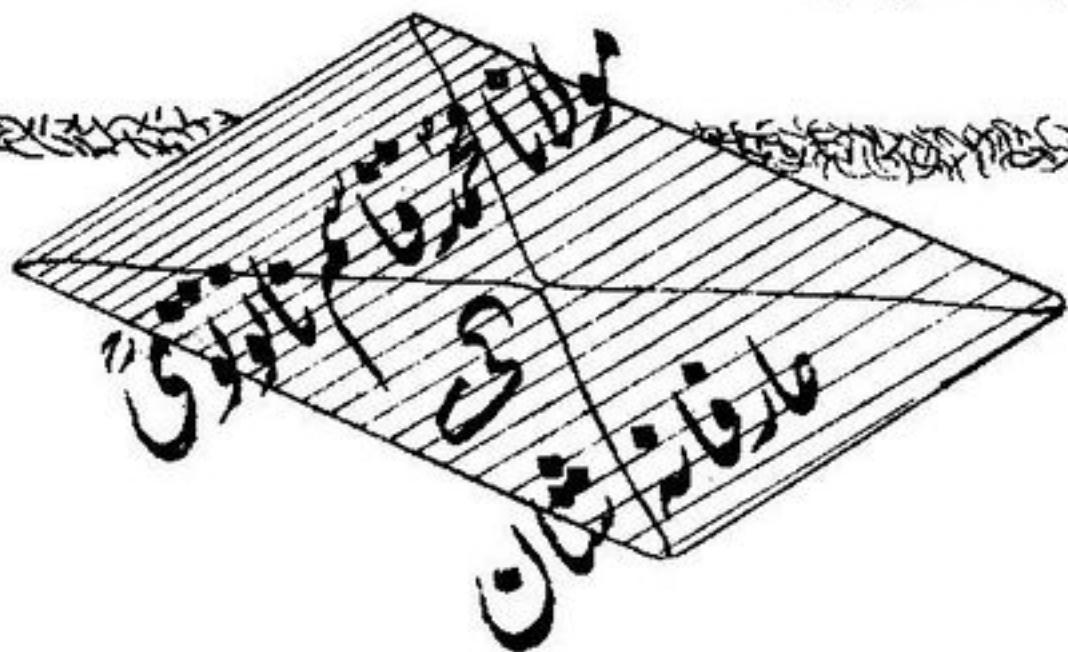
محترمی و مکرمی زید مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون ـــ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔ آپ نے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ اور ان جیسے دوسرے اکابر کے بارہ میں ان کے بیان کی مقبولیت اور جاذبیت کے بارہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ حقیقت ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات بظاہر تو فلسفیانہ ہوتی ہیں، مگر حقیقتاً عارفانہ اس لئے اثر قلب پر یہ پڑتا ہے کہ جیسے کوئی مربی تربیت کر رہا ہو۔ اس کی وجہ محض علم نہیں بلکہ معرفت ہے۔ اور محض معرفت بھی نہیں بلکہ انکشاف اور ان کا حال ہے۔ صاحبِ حال کی ہر چیز میں کشش جاذبیت اور مقبولیت ہوتی ہے۔ حضرت کے علوم الہامی ہیں کتابی نہیں۔ ماخوذ کتاب و سنت سے ہیں۔ اور کتاب و سنت کی روح ان کے اندر سمائی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ روح کی بات اندر سے کھینچ لاتے ہیں۔ اور وہی موثر ہوتی ہے۔ چونکہ وہ خود اس سے لطف اندوز ہیں اس لئے مطالعہ کنندہ بھی اس سے لطف اندوز ہوتا ہے ـــ از دل خیزد بر دل ریزد ـــ یہ علوم درحقیقت علمِ الٰہی سے متصل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تاثیر بھی قوی اور کامل ہوتی ہے۔ حضرت ہی نے تقریر دلپذیر میں ایک موقعہ پر جہاں غالباً مسئلہ تقدیر بیان فرما رہے ہیں، ارشاد فرمایا کہ یہاں پہنچ کر اک دم طبیعت رک گئی اور بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا لکھوں تو آخر کار میں نے اسی پروگرام کی طرف رجوع کیا جہاں سے بندوں کو علم کی روزی ملتی ہے۔ اور میں نے کہا کہ ؎

قطرۂ دانش کہ دادستی زبیش   متصل گرداں بدریا ہائے خویش

آخرکار فتح یاب ہوا اور میرے اللہ نے بات سمجھائی اور پھر لکھا کہ: آنچہ بصفحہ خاطرم ریزند بقلم می آرم (اولکما قال) اس سے واضح ہے کہ یہاں کی یہ جذب وکشش محض رسمی علم میں نہیں بلکہ عارفانہ اور عاشقانہ علوم میں ہوتی ہے۔ عاشق جب اپنی دیوانگی میں بولتا ہے۔ اور گرج پڑتا ہے تو سب لرز جاتے ہیں، وہ اس کے قلب اور اُدھر کے کشاکش کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے تاثیر درحقیقت الفاظ میں نہیں بلکہ قلب کے ان احوال میں ہے جو اپنے ظہور کیلئے الفاظ کا جامہ خود تراش لیتے ہیں ـــــ

مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ جن کیفیات سے وہ علم صادر ہوتا ہے، اسی نوع کی تھوڑی بہت کیفیت آشنائی جب کسی میں ہوتی ہے تو وہ اثر قبول کرتا ہے۔ ورنہ بے کیف اور جاہل مطلق افراد پہ کوئی چیز بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس لئے جہاں آپ ان ارباب علوم کی تعریف فرما رہے ہیں اس میں دوسرا پہلو آپ کی خود کی واقعی تعریف کا بھی نکلتا ہے، خواہ آپ کو احساس نہ ہو۔ آپ میں بحمد للہ ان کیفیات سے شناسائی کسی حد تک موجود ہے تو اس حد تک تاثر بھی ہے اور اسی حد تک یہ خواہش بھی ہے کہ کاش آپ بھی اسی قسم کے بیان پر قادر ہو جاویں اور ویسا ہی کلام کرنے لگیں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ کمال ابتداءً کسبی ہی ہے۔ اگرچہ انتہاءً وہبی رہے۔ صرف نبوۃ ہی وہ کمال ہے جو کسبی نہیں صرف وہبی ہے جو صرف داد حق سے ملتا ہے ورنہ آثار نبوۃ میں سے تمام علمی وعملی واخلاقی کمالات اکتساب سے تعلق رکھتے ہیں جو ہر ایک کو حاصل ہو سکتے ہیں، مگر جب بھی حاصل ہوگا اسی کے ظرف وذہن کی قدر حاصل ہوگا اور ظروف اور اذہان کی بناوٹ خلقی ہے جس میں تفاوت ہے۔ اس لئے ایک کمال سب میں آکر پھر بھی علیٰ قدر الذہانت متفاوت ہو جائے گا۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی نقل اتار کر ویسا نہیں ہو سکتا جسکی نقل اتاری گئی ہے جس طرح ہر ایک کی چال الگ الگ ہے، نقل سے ویسے ہی انداز سے آدمی چلے گا بھی تو نبھ نہ سکے گا اور آخرکار پھر اپنی ہی چال پر آجائے گا یا جیسے صورت ہر ایک کی الگ الگ ہے، تصنع سے صورت کو مشابہ بنانے کی کتنی بھی کوشش ہو مشابہ بن نہ سکے گی، اور کسی حد تک بن جائے گی تو فرق صاف نمایاں رہے گا۔ اور اتفاقاً نمایاں نہ بھی ہو تو یہ نقل دیرپا نہ ہو سکے گی۔ اس لئے کسی کی نقل کی فکر ہی نہ کی جاوے جبکہ وہ بس کی بات نہیں، البتہ خود اپنے خلقی جوہر کو اجاگر کرنے اور چمکانے کی کوشش کی جاوے اور جب وہ حد کمال پر پہنچ جائے گا جب ہی اس میں جاذبیت اور مقبولیت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے مقبولیت کی بنیاد اور جاذبیت کی اساس تکمیل نفس یا اس کے کسی وصف کی حد کمال ہے انتقالی نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کمالات باطن اگر حد کمال پر آجائیں تو ان کی جاذبیت عمومی ہوتی ہے۔ اور حقیقی اور کمالات ظاہر کی محدود اور وقتی۔

ان سارے ہی بزرگوں کے کلام میں قبولیت اور جاذبیت ہے جو ان کے مجاہدات ظاہرہ یا

کا اثر ہے، لیکن پھر بھی مجاذبیت کے درجات متفاوت ہیں جو ان کی ذہنی صلاحیتوں کے تفاوت کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے آدمی مجاہدہ و ریاضت تو کرے لیکن نہ اس لئے کہ اس میں فلاں کا رنگ پیدا ہو جائے بلکہ اس لئے کہ صبغۃ اللہ پیدا ہو جائے اور پھر صبغۃ اللہ جس قسم کے شیشۂ ذہن سے نمایاں ہوگا اسی قسم کا رنگ اختیار کرے گا۔ اور جاذبیت کا مقام پیدا کرے گا۔ مگر متفاوت ضرور رہے گا۔ اس لئے کہ وہ خلقت کا تفاوت ہے۔ ولا تبدیل لخلق اللہ۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس لئے آپ کائنات کے خلقی اختلاف کو مٹانے کی فکر نہ فرمادیں کہ وہ بس کی بات نہیں، یہ اختلاف بہر حال اپنی جگہ ضرور باقی رہے گا۔ صرف اپنے رنگ کو نکھارنے اور حد کمال پر پہنچانے کی سعی فرمادیں۔۔۔۔۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ سے (جو دار العلوم کے اولین صدر مدرس اور عارف کامل تھے) کسی نے پوچھا کہ کتابیں آپ نے بھی وہی پڑھی ہیں جو حضرت نانوتوی نے پڑھی تھیں۔ استاد بھی آپ دونوں کے ایک ہیں پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ جو علوم وہ بیان کرتے ہیں۔ اور جو انداز بیان ان کا ہے وہ آپ کا نہیں۔؟ فرمایا اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغ کی ساخت ہی حکیمانہ تھی۔ وہ کوئی معمولی سے معمولی مسئلہ بھی بیان کرتے تو وہ حکیمانہ ہی رنگ کا ہوتا اس لئے جو مضمون بھی ان کے دماغ میں ڈھل کر باہر آتا تھا وہ حکیمانہ ہی رنگ اختیار کر لیتا تھا، اس جواب کا حاصل بھی وہی ہے کہ کسب و ریاضت ظاہری ہو یا باطنی اس کے ثمرات کا تفاوت خلقتوں کے تفاوت سے ہوتا ہے۔۔۔ انبیاء علیہم السلام سب کے سب مقدس اور بشریت کے انتہائی کمالات پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن تفاوت مراتب اور تفاضل بھی ان میں موجود اور قرآن حکیم میں منصوص ہے اس کی وجہ کمالات نبوۃ کا زیادۃ و نقصان نہیں بلکہ ظروف کا قدرتی تفاوت ہے، ان کمالات الٰہیہ سے مزاجی خصوصیات زائل نہیں ہوتیں بلکہ انہی مزاجی خصوصیات میں سے گزر گزر کر وہ کمالات نمایاں ہوتے ہیں اور خصوصیات متفاوت ہیں۔ اس لئے رنگ کمالات بھی متفاوت ہو جاتا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی جلالی شان ہے عیسیٰ علیہ السلام کی جمالی شان ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی حزن و بث کی شان ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ شان ہے۔ ایوب علیہ السلام کی صابرانہ شان ہے، داؤد علیہ السلام کی شاکرانہ شان ہے۔ ان سب شانوں میں کمال نبوۃ مشترک ہے اور خود شانیں متفاوت۔ ظاہر ہے کہ یہ نبوۃ کے تنافات سے نہیں کہ وہ سب میں یکساں ہے۔ بلکہ خلقی ظروف کے تفاوت سے ہے۔ اس لئے

یہاں نہ نقل کی گنجائش ہے نہ عقل کی، بلکہ کسب وعمل کی ضرورت ہے، جو رنگ فطری ہے۔ بلا کسب کے ہر ایک کا خود اپنا ہی نمایاں ہو جائے گا۔ اور وہی مقبول ہوگا۔ اس کے حاصل کرنے یا تبدیل کرنے کی سعی غیر ضروری بلکہ بے ثمرہ جائے گی اس لئے اس کی فکر ہی کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک اس ناکارہ کے بارہ میں حسن ظن کے الفاظ تحریر فرمائے گئے ہیں، حق تعالیٰ آپ کو اسی کا اجر دے۔ اور مجھے ان کا صحیح مصداق بنادے ——— وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۳۸۱ھ

بقیہ : اسوہ نبویؐ اور عصری شہریت

معاشی مساوات اس حالت پر ہیں۔ کہ جو ادنیٰ مسلمان کو میسر آتا ہے۔ سردار عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء اس سے کم لیتے اور نوش فرماتے ہیں۔ بنیادی ضروریات زندگی کی فراوانی کا یہ حال ہے۔ کہ بے سروسامان اور فاقہ کش عرب، شہریت انسانی کی اس خدائی قلم رو میں بیس سال کے عرصہ میں فارغ البالی کے اس مقام پر پہنچتے ہیں۔ کہ صدقہ وزکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا۔ تمام شہری اسلامی مملکت کے وفادار اور اپنے مقصد کے لئے جان قربان کرنے والے انسانوں کو انسانوں کے خود ساختہ بندگیوں کی زنجیروں سے آزاد کرانے والے اور عالم گیر اخوت ومحبت وخدمت وایثار کا نمونہ پیش کرنے والے ہیں ——— غرض انسان کامل اور معلم انسانیت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کمال بشریت انسانی کا درس دیا وہ آج بھی اس پریشان حال انسانیت کے مداوی اور انسانی مشکلات کا آخری حل ہے۔ سلام ہو اللہ تعالیٰ کے اس فرستادہ پر جو آسمانی مملکت اس عالم میں قائم کرنے آیا تھا۔ اور درود ہو اس پر جس نے عالم گیر انسانی شہریت کے زرین اصول بتائے ——— ۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان)

جناب وحید الدین خان
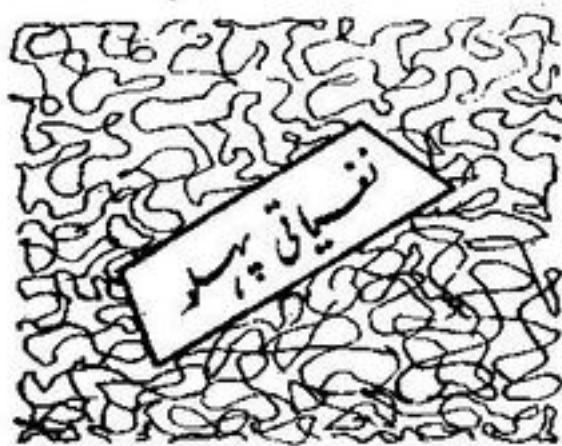
عقیدۂ آخرت

جدید تحقیقات کی روشنی میں

اس سے پہلے ہم نے آخرت کے تصور پر اس حیثیت سے بحث کی ہے کہ موجودہ کائنات میں کیا اس قسم کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن ہے جس کا مذہب میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ آخرت قطعی طور پر ممکن الوقوع ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ کیا ہماری دنیا کو اس قسم کی آخرت کی کوئی ضرورت بھی ہے۔ کیا کائنات اپنے موجودہ ڈھانچہ کے اعتبار سے تقاضا کرتی ہے کہ آخرت لازماً وقوع میں آئے۔

سب سے پہلے نفسیاتی پہلو کو لیجئے۔ ننگھم نے اپنی کتاب (PLATO'S APOLOGY) میں زندگی بعد موت کے عقیدے کو خوش کن لا ادریت (CHEERFUL AGNOSTICISM) کہا ہے۔ یہی موجودہ زمانے میں تمام بے خدا مفکرین کا نظریہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کی اس ذہنیت نے پیدا کیا ہے، کہ وہ اپنے لئے ایک ایسی دنیا تلاش کرنا چاہتا ہے، جہاں وہ موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور مشکلات سے آزاد ہو کر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے۔ یہ عقیدہ انسان کی محض ایک مفروضہ خوش فہمی ہے جس کے ذریعہ وہ اس خیالی تسکین میں مبتلا رہنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی محبوب زندگی کو پا لے گا۔ ورنہ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے، ایسی کوئی دنیا واقعہ میں موجود نہیں۔ مگر انسان کی یہ طلب بذات خود آخرت کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے۔ جسطرح پیاس کا لگنا پانی کی موجودگی اور پانی اور انسان کے درمیان ربط کا ایک داخلی ثبوت ہے، اسی طرح ایک بہتر دنیا کی طلب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی ایک دنیا فی الواقع موجود ہے۔ اور ہم سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے عالمگیر پیمانے پر یہ طلب انسان کے اندر موجود رہی ہے۔

اب یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ ایک بے حقیقت چیز اتنے بڑے پیمانے پر اور اس قدر ابدی شکل میں انسان کو متاثر کر دے۔ ایک ایسا واقعہ جو ہمارے لئے اس امکان کا قرینہ پیدا کرتا ہے کہ دوسری بہتر دنیا موجود ہونی چاہئیے۔ خود اسی واقعہ کو فرضی قرار دینا صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اتنے بڑے نفسیاتی تقاضے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پھر اس زمین پر وہ کون سا واقعہ ہے جس کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اور اگر سمجھتے ہیں تو اس کے لئے ان کے پاس کیا دلیل ہے۔ یہ خیالات اگر صرف ماحول کا نتیجہ ہیں تو وہ انسانی جذبات کے ساتھ اتنی مطابقت کیوں رکھتے ہیں۔ کیا دوسری کسی ایسی چیز کی مثال دی جا سکتی ہے، جو ہزاروں سال کے دوران میں اس قدر تسلسل کے ساتھ انسانی جذبات کے ساتھ اپنی مطابقت باقی رکھ سکی ہو۔ کیا کوئی بڑے سے بڑا قابل شخص یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک فرضی چیز گھڑے اور اس کو انسانی نفسیات میں اس طرح شامل کر دے۔ جسطرح یہ احساسات انسانی نفسیات میں سموئے ہوئے ہیں۔

انسان کی بہت سی تمنائیں ہیں جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتیں۔ انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے، جہاں صرف زندگی ہو، مگر اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے جہاں زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے علم، تجربہ اور جدوجہد کے نتیجہ میں جب اپنی کامیاب ترین زندگی کے آغاز کے قابل ہوتا ہے، اسی وقت اس کے لئے موت کا پیغام آجاتا ہے۔ لندن کے کامیاب تاجروں کے متعلق اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ۴۵ - ۶۵ سال کی عمر کے درمیان جب وہ اپنا کاروبار خوب جما لیتے ہیں اور پانچ ہزار تا دس ہزار پونڈ (ایک لاکھ روپے سے زیادہ) سالانہ کما رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت اچانک ایک روز ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ونوڈ ریڈی (WINWOOD READE) لکھتا ہے:

"یہ ہمارے لئے ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ خدا سے ہمارا کوئی ذاتی رشتہ ہے۔ کیا اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے، جہاں ہمارے عمل کے مطابق ہم کو بدلہ دیا جائے گا۔ یہ نہ صرف فلسفہ کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے بلکہ یہ خود ہمارے لئے سب سے بڑا عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہمارا مفاد بہت زیادہ وابستہ ہے۔ موجودہ زندگی بہت مختصر ہے اور اس کی خوشیاں بہت معمولی ہیں۔ جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں، تو موت کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے۔ اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص اس طرح زندگی گزارنے سے انکار نہیں کرے گا۔"

(MARTYRDOM OF MAN. P. 414)

ـــــ مگر یہی مصنف فطرت کی اتنی بڑی پکار کو محض ایک معمولی سے اشکال کی بنا پر رد کر دیتا ہے:

> "یہ نظریہ اس وقت تک بظاہر بڑا معقول نظر آتا تھا جب تک گہرائی کے ساتھ ہم نے اس کی تحقیق نہیں کی تھی۔ مگر جب ایسا کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ یہ محض ایک لغو (ABSURD) بات ہے اور اس کی لغویت کو بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے ـــــ محروم العقل آدمی جو کہ اپنے گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہے وہ تو جنت میں جائے گا۔ مگر گوئٹے اور روسو جیسے لوگ جہنم میں جلیں گے! اس لئے محروم العقل پیدا ہونا اس سے اچھا ہے کہ آدمی گوئٹے اور روسو کی شکل میں پیدا ہو۔ اور یہ بات بالکل لغو ہے۔"

یہ ایسی ہی بات ہے جیسے لارڈ کلون (KELVIN) نے میکس ویل (MAXWELL) کی تحقیق ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ لارڈ کلون کا کہنا تھا کہ "جب تک میں کسی چیز کا مشینی ماڈل (MACHANICAL MODEL) نہیں بنا لیتا میں اسے سمجھ نہیں سکتا" اس بنا پر اس نے روشنی کے متعلق میکسویل کے برقی مقناطیسی نظریے کو قبول نہیں کیا کیونکہ وہ اس کے مادی فریم میں نہیں آتی تھی۔ طبیعات کی دنیا میں آج یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ ڈبلیو۔ این۔ سولیون (SULLIVAN) کے الفاظ میں ـــ "ایک شخص کیوں ایسا خیال کرے کہ فطرت کو ایک ایسی نوعیت کی چیز ہونا چاہئے جس کو انیسویں صدی کا ایک انجینئر اپنے کارخانہ میں ڈھال سکتا ہو۔"[1] یہی بات میں ون وڈ کے مندرجہ بالا اعتراض کے بارے میں کہوں گا ـــــ بیسویں صدی کا ایک فلسفی آخر یہ سمجھنے کا کیا حق رکھتا ہے کہ خارجی دنیا کو اس کے اپنے مزعومات کے مطابق ہونا چاہئے۔"

مصنف کی سمجھ میں اتنی موٹی سی بات نہیں آئی کہ حقیقت واقعہ خارج کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود خارج حقیقت واقعہ کا محتاج ہوتا ہے۔ جب حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور اس کے سامنے حساب کتاب کے لئے ہمیں حاضر ہونا ہے۔ تو پھر ہر شخص کو خواہ وہ روسو ہو یا ایک معمولی شہری، خدا کا وفادار بن کر زندگی گزارنی چاہئے۔ ہماری کامیابی حقیقت سے موافقت کرنے میں ہے نہ کہ اس کے خلاف چلنے میں۔ مصنف روسو اور گوئٹے سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنائیں، بلکہ خود حقیقت واقعہ سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدل ڈالے۔ اور جب وہ اپنے اندر تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتی تو حقیقت واقعہ کو لغو قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص جنگی راز کے تحفظ کے قانون کو اس بنا پر لغو قرار دے کہ اس کی رو سے بعض اوقات ایک معمولی سپاہی کا کام قابل تعریف قرار پاتا ہے۔ اور روزن برگ جیسے ممتاز سائنسدان اور اسکی نوجوان اور حسین بیوی (ROSENBERG PAIR) کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر پھانسی دے دی جاتی ہے۔

---

[1] THE LIMITATIONS OF SCIENCE.

ساری معلوم دنیا کے اندر صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (TOMORROW) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بہت سے جانور بھی "کل" کے لئے عمل کرتے ہیں مثلاً چیونٹیاں گرمی کے موسم میں جاڑے کے لئے خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے لئے گھونسلا بناتا ہے۔ مگر جانوروں کا اس قسم کا عمل محض جبلت کے تحت غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ وہ "کل" کی ضرورتوں کو سوچ کر بالقصد ایسا نہیں کرتے، بلکہ بلا ارادہ طبعی طور پر انجام دیتے ہیں اور بطور نتیجہ وہ ان کے مستقبل میں انہیں کام آتا ہے۔ "کل" کو ذہن میں رکھ کر اسکی خاطر سوچنے کے لئے تصوری فکر (CONCEPTUAL THOUGHT) کی ضرورت ہے۔ اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے، کسی دوسرے جاندار کو تصوری فکر کی خصوصیت حاصل نہیں۔

انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مواقع ملنے چاہئیں، جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے وہ زندگی کا کوئی "کل" نہیں رکھتے۔ مگر انسان کا مطالعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس کے لئے ایک کل ہونا چاہئے۔ ایسا نہ ہونا نظام فطرت کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ زندگی میں ہماری ناکامیاں عام طور پر ہم کو اس سے بہتر ایک زندگی کی توقع کی طرف لے جاتی ہیں۔ ایک خوش حال فضا میں ایسا عقیدہ باقی نہیں رہ سکتا۔ روم کے غلام، مثال کے طور پر، بہت بڑی تعداد میں عیسائی ہو گئے۔ کیونکہ عیسائیت ان کو آسمان میں خوشی حاصل ہونے کی توقع دلاتی تھی۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے انسان کی خوشی اور خوش حالی بڑھے گی۔ اور بالآخر دوسری زندگی کا تصور ختم ہو جائے گا۔

مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی چار سو سولہ تاریخ اسکی تصدیق نہیں کرتی۔ ٹکنالوجی کی ترقی نے سب سے پہلے دنیا کو جو چیز دی وہ یہ تھا کہ سرمایہ رکھنے والے محدود گروہ کو ایسے وسائل و ذرائع ہاتھ آ گئے جس کے بل پر وہ چھوٹے کاریگروں اور پیشہ وروں کو ختم کر کے دولت کا تمام بہاؤ اپنی طرف کر لیں اور عام باشندوں کو محض اپنا محتاج مزدور بنا کر رکھ دیں۔ اس انجام کے ہولناک مناظر مارکس کی کتاب "کیپٹل" میں تفصیل کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو گویا اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اس مزدور طبقہ کی چیخ ہے، جس کو مشینی نظام نے اپنے ابتدائی دور میں جنم دیا تھا۔ اس کے بعد ردعمل شروع ہوا اور مزدور تحریکوں کی ایک صدی کی کوشش سے اب حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ مگر یہ تبدیلی صرف ظاہر کی تبدیلی ہے۔ بیشک آج کا مزدور پہلے کے مقابلے میں زیادہ اجرت پاتا ہے۔ لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کی دولت کا تعلق

ہے، اس معاملے میں وہ اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ محروم ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے جو نظام بنایا ہے، وہ کچھ مادی ظواہر انسان کو دے دے۔ مگر خوشی اور اطمینانِ قلب کی دولت پھر بھی اسے نہیں دیتا۔
تہذیب جدید کے انسان کے بارے میں بلیک (BLAKE) کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں۔

A MARK IN EVERY FACE I MEET

MARKS OF WEAKNESS MARKS OF WOE

برٹرینڈ رسل نے اعتراف کیا ہے کہ — "ہماری دنیا کے جانور خوش ہیں۔ انسانوں کو بھی خوش ہونا چاہئے۔ مگر جدید دنیا میں انہیں یہ نعمت حاصل نہیں۔"
بلکہ رسل کے الفاظ میں اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اس کا حصول ممکن ہی نہیں؛

HAPPINESS IN THE MODERN WORLD HAS

BECOME AN IMPOSSIBILITY (P. 93)

نیویارک جانے والا ایک سیاح ایک طرف تو اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارتوں کو دیکھتا ہے جس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں اور جو اتنی اونچی ہے کہ اس کا اوپر کا ٹمپریچر نیچے کے مقابلے میں کافی سرد ہو جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اتریں تو یہ مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آپ اس پر گئے تھے، ۱۲۵۰ فٹ بلند عمارت پر چڑھنے میں لفٹ کے ذریعہ صرف تین منٹ لگتے ہیں، ان عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر وہ کلب میں جاتا ہے۔ وہاں وہ دیکھتا ہے کہ عورت مرد مل کر خوب ناچ رہے ہیں۔ "کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ" وہ سوچتا ہے۔ مگر زیادہ دیر گزرنے نہیں پاتی کہ اس جھنڈ میں سے ایک نوجوان عورت آکر اس کے پاس کی نشست پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ بہت افسردہ ہے:

"سیاح! کیا میں بہت بدصورت ہوں" عورت کہتی ہے۔

"میرا خیال تو ایسا نہیں"

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں رعنائی (GLAMOUR) نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو تم میں گلےمر ہے"

"شکریہ۔ لیکن اب نہ مجھے نوجوان ٹیپ (TAP) کرتے ہیں، اور نہ ڈیٹ (DATE) مانگتے ہیں۔ مجھے زندگی ویران نظر آنے لگی ہے۔"

یہ جدید دور کے انسان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے صرف مکانوں کو ترقی دی ہے۔ اس نے مکینوں کے دل کا سکون چھین لیا ہے، اس نے شاندار مشینیں کھڑی کی ہیں مگر ان مشینوں میں کام کرنے والے انسانوں کو چین سے محروم کر دیا ہے۔ یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی چار سو سالہ تاریخ کا آخری انجام ہے۔ پھر کس بنیاد پر یقین کر لیا جائے کہ سائنس اور ٹکنالوجی وہ سکون اور مسرت کی دنیا بنانے میں کامیاب ہوگی جس کی انسان کو تلاش ہے؟

اسوۂ نبویہ اور عصری شہریت

مولانا محمد اشرف ایم۔ اے
صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور

یہ ڈیڈیائی عنوانات عصری تسخ کے ہوتے ہیں۔ یہ نشریہ "انسانِ کامل ایک شہری کی حیثیت سے" کے عنوان پر تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ انسانی خود ساختہ شہریت کے معیاروں سے ذات ستودہ صفات علیہ الف الف تحیۃ وسلام کو بچاکر صحیح اسلامی نظریہ پیش کیا جائے۔ (م۔ ک)

ہمارے آقا سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور انسانی فضل وکمال کا انتہائی نکتۂ معراج تھے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام انسانوں کے لئے قیامت تک راہ نمائی اور ہدایت کا سبب ہے۔ انسانیت کے تمام طبقات کے لئے آپ کی کامل زندگی اور مکمل تعلیمات ہر زمانہ میں مشعلِ ہدایت اور ذریعۂ نجات ہیں۔ شاہ وگدا حاکم ومحکوم، امیر وغریب، تاجر وزارع، صنعت کار ومزدور، عورت ومرد، جوان اور بوڑھا ہر ایک اس آفتابِ نور سے فیض وروشنی حاصل کرسکتا ہے۔ نبی کی آمد اس دنیا میں ہدایت کے عام کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی ذات سراپا رشد وہدایت ہوتی ہے۔ اور نبی اس زندگی کے کسی عمل میں بھی مشغول ہو انسانیت کی رہنمائی کے لئے اس کی ذات سے ہر آن ہدایت کے انوارات نکل کر دوسروں کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ اس کا دل بینا حقائق آشنا ہوتا ہے۔ اور بے محابا اس کے قول وعمل سے حق وباطل میں تفریق ہوتی جاتی ہے۔ اس پر زندگی کے جملہ شعبوں کے حقائق خوبیاں اور برائیاں کھولی جاتی ہیں وہ اپنی نبوی آنکھ سے خیر وشر کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ایک کامل نمونہ کی زندگی پاتا اور اپناتا ہے۔ اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنی الٰہی بصیرت وروشنی کی بنا پر انسانیت کے جملہ طبقات کو ان ہدایات سے روشناس کرتا ہے جس میں ان کی دائمی دنیاوی واخروی کامیابی وفلاح پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ انسانوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں میں زندگی گزارتا ہے۔ انسانی

اعمال اس سے طبعاً سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ہر قول و عمل کی خدائی حفاظت اور اس کے ہر قدم و نظر کی ربانی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کی ذات بشریت کا کمال اور بنی آدم کا فخر ہوتی ہے۔ وہ اس دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کی ہر حرکت و سکون آسمانی احکام کی پابندی ہوتی ہے۔ اور بشریت کے باوجود وہ پاکیزگی اور معصومیت کا فرشتہ نظر آتا ہے۔ ہمارے آقا سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاصانِ خدا اور پیغمبرانِ ذی جاہ کے سلسلہ کی آخری کڑی اور ان سب کے سردار تھے۔ اور ہدایت ربانی کے لئے آئے تھے۔ اس لئے آپ جملہ انبیاء کے محاسن و فضائل و کمالات کو اپنی ذاتِ عالی میں سموئے ہوئے تھے۔ اس لئے آپ سب انبیاء میں شرف و فضیلت، تکمیل و جامعیت کے لحاظ سے نمایاں و ممتاز اور گلشنِ نبوت کے گلِ سرسبد تھے۔ آپ کی شان سب سے نرالی، کام سب سے اونچا، کردار سب سے پیارا، نمونہ سب سے اعلیٰ، کمال سب سے انوکھا اور دائرہ سب سے وسیع و مکمل تھا۔ آپ کا ہر قول و فعل نظریہ و عمل اپنی جامعیت و کاملیت میں اپنی نظیر آپ اور دلکشی اور محبوبیت میں لاثانی اور بے مثال تھا۔ ؎

تو ہے مجموعۂ خوبی و سراپائے جمال کون سی تیری ادا دل کی طلبگار نہیں

جہاں نبوت کے نور سے خالی حکماء و فضلاء کے علم و عقل کی آخری سرحد ہے۔ اس سے آگے ایمانی حکمت و دانائی کی ابتداء ہوتی ہے۔ نبی حکمت و دانائی وسعتِ نظر اور فکر و معرفت کی جس بلندی پر ہوتا ہے۔ غیر نبی کا انتہائی پرواز بھی اس کی گرد کو نہیں پا سکتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کی زندگی کو عام انسانی معیار سے جانچنا اور پرکھنا نادانی ہے۔

نبی کے علم و نظر اور عمل کی پاکیزگی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ انسان اپنے جملہ تصورات و معروضہ علوم و پیمانوں سے قطع نظر بے چون و چرا اس کا اتباع کرنے لگے۔ یہ بات اس لئے عرض کی گئی ہے۔ کہ نبی کی زندگی انسانوں کے بنائے ہوئے خاکوں کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وہ متبوع ہوتا ہے۔ مخلوق کا تابع نہیں ہوتا۔ اس سے زندگی کا نمونہ لیا جاتا ہے۔ اسے دوسرے انسان زندگی نہیں سکھا سکتے۔ اس بنا پر کسی نبی کی زندگی کے کسی پہلو کا جائزہ بھی ہم انسانی تراشیدہ اصولوں اور معیار سے نہیں کر سکتے ـــ خاص کر سید النبیین ـــ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہم انسانی فکر نارسا کی کسوٹی پر نہیں پرکھ سکتے۔ اس لئے جب ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا مطالعہ ایک شہری یا تاجر کی حیثیت سے کریں گے۔ اس وقت یہ حقیقت ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی ہو گی۔ کہ اولین و آخرین کے سردار سید ولد آدم خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے کسی جدید و قدیم

مفکر و حکیم و نظریاتِ شہریت یا اصولِ تجارت پر نہیں پرکھیں گے۔ بلکہ انسانیت کے اس سب سے بڑے معلم سے سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ کہ آپ جس عالمگیر و ہمہ گیر دعوت و دین کے داعی تھے۔ اور آپ نے جس انسانی برادری کی طرح ڈالی تھی اور تمام نسلِ انسانی کی جس آفاقی و مکمل مملکت کی بنیاد رکھنی تھی۔ اس کا تصور بھی دنیا کے دیگر حکماء و فضلاء نہیں کر سکتے۔ اسلام کی آفاقی و عالمگیر شہریت، یونان کی شہری مملکتوں یا عصرِ حاضر کی نسلی و لونی حکومتوں یا محدود معاشی و سیاسی نظریوں پر مبنی دولتوں میں نہیں سما سکتی۔ افلاطون و ارسطو لارڈ برائس ڈیل وغیرہ کے نظریات شہریت ام القریٰ کے اسی معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

آپ نے دارالاسلام کی جس عالمگیر مملکت کی بنیاد ڈالی، اس کا کمال یہ تھا کہ یورپ کے نام نہاد تمدن و استیلاء سے پیشتر مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں بھی ابن بطوطہ سا جہاں گرد سیاح یا سعدی جیسا بے نوا درویش پاسپورٹ و کرنسی کی موجودہ پابندیوں سے دوچار ہوئے بغیر دنیا میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے اسلامی ممالک میں یہ کہتے ہوئے پھر جاتا تھا کہ ــــ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔ ــــ اور جہاں جاتا مسلمانوں کے ہمہ گیر جذبۂ اخوت کی بنا پر اپنے کو اپنے وطن بلکہ اپنے گھر میں پاتا تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو بتایا کہ تمام زمین اللہ تعالیٰ کی مملکت ہے۔ جس پر الٰہی بالادستی و سروری قائم ہے۔ اور تمام انسان رنگ و نسل، ملک و وطن کے اختلاف کے باوجود اس کے بندہ ہیں۔ پس جو شخص اس الٰہی مملکت میں بستا ہے۔ اور خدا کی خدائی کو مانتا ہے۔ اور اس کے احکام کی پابندی اختیار کرتا ہے، وہ ہر اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا بھائی ہے، جس کے خاص حقوق و فرائض ہیں۔ جن کی پابندی و ادائیگی ان میں سے ہر ایک شخص پر لازم ہے۔ الٰہی مملکت کے ان ماننے والوں کا طبقہ مومن و مسلم یعنی ماننے والا و فرمانبردار کہلاتا ہے۔ اور یہی اصل میں خدائی مملکت کے اصل شہری ہیں۔ ان کے علاوہ جو خداوند تعالیٰ کی حاکمیت و احکام کو نہ ماننے والا ہے۔ وہ کافر کہلاتا ہے۔ اس کی مثال آج کل کی اصطلاح میں غیر ملکی " ALIEN " کی ہے۔ اگر وہ اس میں رہتا ہے۔ تو اُس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت بھی ماننے والوں کی طرح ہے۔ اور اگر باغی اور سرکش ہیں تو حقوقِ شہریت کو زائل کر دیتا ہے۔ بہرحال انسانیت کے جملہ طبقات کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیال اللہ قرار دے کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اُس کے عیال کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔ علمائے شہریت اور سیاست کہتے ہیں۔ کہ ہر شہری کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اور ان حقوق کی بنا پر اُس پر فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اچھا شہری وہ ہے، جو فرائض کی ادائیگی میں حقوق طلبی کی نسبت زیادہ سرگرم ہو۔ آج دنیا میں مزدور اور سرمایہ دار کا جھگڑا، حاکم و محکوم میں

رقابت، بیچنے اور خریدنے والوں میں منافست اور ہر طبقہ میں فساد کا سبب یہ ہے۔ کہ حقوق کا تو ہر ایک طالب ہے۔ لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی سے غفلت برتتا ہے۔ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ایک طرف حقوقِ انسانی کا بے مثل منشور دنیا کو پیش فرمایا اور آقا اور خادم، حاکم، محکوم عزیز واقارب اپنے اور بیگانے مسلم اور غیر مسلم مملکت، امیر کے حقوق یہاں تک کہ انسان سے آگے حیوان تک کے حقوق بیان فرمائے اور جس طبقہ کا مفاد جس گروہ سے وابستہ تھا، اس کے مفاد کو دوسرے گروہ پر لازم فرما کر اُس کا دین بنا دیا۔ اور اعلان فرما دیا۔ لا یومن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ۔ تم میں سے اُس وقت تک کوئی ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک دوسرے انسان کیلئے وہی بھلائی نہ چاہو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ وہاں اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنے حقوق کو نہ طلب کرنے کا ایسا جذبہ انسانوں میں پیدا فرمایا اور ان کا نمونہ پیش کیا۔ کہ شہریت کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنا ذاتی بدلہ کسی سے نہیں لیا۔ زہر کھلانے والی یہودیہ کو جانتے ہوئے معاف فرما دیا اور اپنے قتل کی سازش کرنے والوں، وطن سے بے وطن اور ہر قسم کی ایذائیں دینے والوں، جن کی تلواروں سے اب تک خون ٹپک رہا تھا۔ سب سے بڑی کامیابی کے دن فتح مکہ کے روز یہ کہہ کر معاف کر دیا۔ کہ آج کے دن تم پر کوئی سختی نہیں۔ تم سب آزاد ہو۔ جب پورا عرب زیرِ نگین تھا، اُس وقت بھی آسمانی بادشاہت کا شہزادہ دوسروں کو کھلا کر خوب بھوکا رہتا تھا۔ جس وقت اس پر ایک پرجلال شہنشاہ کا دھوکہ ہوتا تھا۔ اس ذاتِ مبارک کا کل سرمایہ ایک کھری چارپائی، ایک مٹھی ستو اور چمڑے کا ایک مشکیزہ تھا۔ وہ دینے آیا تھا، مخلوق سے لینے نہیں آیا تھا۔ وہ کسی سے اپنے حقوق کا طالب نہیں تھا۔ بلکہ اوروں کے حقوق کی ادائیگی میں سرگرم تھا۔ لارڈ برائس نے اچھے شہری کی صفات ضبطِ نفس، بے نفسی اور ذہانت بتائی ہیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری عمر میں جس ضبطِ نفس، بے نفسی اور اخلاص کے ساتھ گزاری، اس کا تذکرہ سورج کو چراغ بتانا ہے۔ آپ کی تعلیمات کا اثر تھا کہ دین کے فروغ اور پھر اسلامی مملکت اور خلافتِ الٰہیہ کی بقا کے لئے صحابہ کرام نے بغیر کسی دنیاوی لالچ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ہر شہری پر دینی خدمت اور ملکی حفاظت کے لئے جہاد لازم ٹھہرا اور آزادیٔ گفتار اور ضمیر کی وہ آزادی عطا ہوئی کہ ایک بڑھیا اور ایک دیہاتی بدوی امیر المومنین فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کو بھرے مجمع میں ٹوک دیتا ہے۔ اور وہ جب تک اپنی صفائی نہیں کر لیتے دوسری بات نہیں کر پاتے۔

معاشرتی مساوات کا یہ حال ہے کہ آقا و غلام امیر و محکوم شاہ و گدا میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

باقی صفحہ ۱۴ پر

ترتیب و تشریح۔ استاذ عبدالعزیز سید الاھل قاہرہ
ترجمہ :۔ ابن حسین مروی محمد اسلم۔ کراچی

امام شافعیؒ اور شعر

(جاہل کی عبادت)

عبادة جاهلين بغير علم　　كقرطاس تراه بلا كتاب

جاہلوں کی عبادت بغیر علم کے مثل سفید کاغذ کے ہے جس پر نقوش نہ ہوں۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ جسطرح سفید کاغذ بلا کتابت اور مضمون کے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اسی طرح وہ عبادت بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی جسے اس کے شرائط اور ارکان کے مطابق نہ کیا جائے اور یہ "علم" کے بغیر ناممکن ہے، اس قانون پر تمام اہل شریعت اور صوفیاء کا اتفاق ہے۔

(عنایت نفس)

بلوت بني الدنيا فلم ارفيهم　　سوى من غدا والبخل مل اهابه

میں نے ابنائے دنیا کو آزمایا تو ان میں صرف ایسے لوگوں کو پایا کہ بخل ان کے رگ و ریشہ میں بھرا ہوا تھا۔

تجردت من عمد القناعة صارماً　　قطعت رجائي منهم بذبابه

پس میں نے قناعت کی نیام سے تلوار سونتی اور اسکی دھار سے اپنی تمام امیدیں ان سے کاٹ لیں۔

مطلب یہ کہ میں نے قناعت، توکل اور تبتل الی اللہ کے ذریعہ تمام دنیا داروں سے اپنا رشتہ امید قطع کر لیا، اب میری قناعت اور عزت نفس کو گوارا نہیں کہ میری ضرورت اور حاجت کا اظہار کسی دنیا دار کے سامنے ہو، علمائے ربانیین کا اصل جوہر یہی ہے۔

فلا ذا يراني واقفاً في طريقه　　ولا ذا يراني قاعد أعند بابه

اب نہ تو وہ مجھے اپنے راستہ میں کھڑا پاتے ہیں، اور نہ اپنے دروازے پر مجھے بیٹھا دیکھتے ہیں۔

غنی بلامال عن الناس کلهم — ولیس الغنی الاعن الشئ لابه

میں مال کے بغیر تمام لوگوں سے غنی ہوں درحقیقت غنی (مالداری) کسی چیز کے مل جانے کا نام نہیں، بلکہ اسکی ہوس ختم ہونے کا نام غنی ہے۔

اذا ظالم یستحسن الظلم مذهبا — ولج عتوا فی قبیح اکتسابه

جب ظالم ظلم ہی کو بہترین روش قرار دیتا ہو اور اپنی بدکاریوں میں برابر بڑھا جا رہا ہو۔

فَكِلْهُ الى صَرْفِ اللَّيالي فانّها — سَتُبْدِي لَهُ مالَمْ يَكُنْ فِي حِسابِهِ

تو اسے گردش ایام کے سپرد کر دو۔ وہ بہت جلد اس کا حساب چکا دے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا۔

مطلب یہ کہ جب ظالم کا ضمیر اس قدر اندھا ہو جائے کہ وہ ظلم ہی کو حق و انصاف کا راستہ تلانے لگے اور اس پر اس کا اصرار بڑھتا چلا جائے، تو اس وقت افہام و تفہیم، وعظ و نصیحت اور دلیل و برہان کے ذریعہ اسکی اصلاح نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کی کوشش بے سود ہے، اب اس کا مقدمہ گردش زمانہ کی عدالت میں پیش کر دو، وہ بہت جلد اس کا فیصلہ کر دے گا۔ اور اس ظالم کو جیتے جی اپنی غلط روی کا انجام معلوم ہو جائے گا، اور آخرت کا عذاب اس پر مستزاد ہے، آئندہ اشعار اس کی دلیل ہیں۔

فکم قد رأینا ظالما متمردا — یری النجم تیها تحت ظل رکابه

چنانچہ ہم نے بہتیرے سرکش ظالم دیکھے ہیں۔ جو (از راہ نخوت) کہکشاں کو بھی اپنی رکاب کے زیر سایہ سمجھتے تھے۔

فعما قلیل وهو فی غفلاته — اناخت صروف الحادثات ببابه

لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اسکی عین غفلت کے وقت حوادث زمانہ نے اس کے دروازے پر ڈیرے ڈال دئے۔

فاصبح لامال ولاجاه یرتجی — ولاحسنات تلتقی فی کتابه

پھر اس نے اس حالت میں صبح کی کہ اس کے پاس نہ تو مال تھا، نہ مرتبہ، نہ نیکیاں ہی تھیں جو اس کے نامۂ عمل میں لکھی جاتیں۔

وجوزی بالامر الذی کان فاعلا — وصب علیه الله سوط عذابه

اور اسکی بداعمالیوں کا ٹھیک ٹھیک بدلہ چکا دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنے عذاب کا کوڑا برسایا۔

(انسان کی مختلف قسمیں)

اصبحت مطرحاً فی معشر جہلوا حق الادیب فباعوا الراس بالذنب

میں ایسے لوگوں میں پڑا ہوا ہوں جو ادیب کے حق سے ناواقف ہیں۔ اس لئے انہوں نے سر کو دم کے بدلے بیچ دیا ہے۔

سر کو دم کے بدلے بیچ دینا ایک محاورہ ہے، مطلب یہ ہے کہ عام طور سے لوگ، اہل علم وادب کی قدر و منزلت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ پیشہ ور قسم کے لوگوں کو تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں جنکی حیثیت "دم گاؤ" سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اہل فضیلت کو نا قدرشناسی کی نذر کردیتے ہیں۔

والناس یجمعھم شمل وبینھم فی العقل فرق وفی الاداب والحسب

لوگ دستار و لباس میں ایک ہی قسم کے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ عقل و دانش، علم و ادب اور حسب و نسب کے اعتبار سے ان میں بڑا فرق ہے۔

کمثل الذھب الابریز یشرکہ فی لونہ الصفر والتفضیل للذھب

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے خالص سونا اور پیتل رنگ میں ایک معلوم ہوتے ہیں مگر فضیلت سونے ہی کو ہے۔

والعود لو لم تطب منہ روائحہ لم یفرق الناس بین العود والحطب

"عود" سے اگر خوشبو کی مہک نہ آتی ہوتی، تو لوگ اس میں اور دوسری لکڑیوں میں فرق نہ کرپاتے۔

(میزان معرفت)

اذا حار امرئش فی معنیین ولم تدر حیث الخطاء والصواب

جب تمہارا معاملہ دو رایوں کے درمیان الجھ جائے اور یہ معلوم نہ ہوسکے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔

فخالف ھواک فان الھوی یقود النفوس الی مایعاب

تو پھر اپنی خواہش کی مخالف رائے کو اختیار کرے۔ کیونکہ خواہش نفس آدمی کو اسی جانب لے جاتی ہے جو معیوب اور غیر پسندیدہ ہوتی ہے۔

امام موصوفؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی معاملہ میں دو رائیں ہوجائیں اور صحیح غلط کا فیصلہ نہ ہوسکے

کہ فائدہ کس میں ہے اور نقصان کس میں۔ تو ایسی صورت میں آدمی کو صحیح اور مفید رائے کا سراغ لگانے کے لئے یہ اصول اور ضابطہ اختیار کرنا چاہیے۔ کہ جو رائے نفس کو زیادہ محبوب اور مفید معلوم ہو اسے ترک کر دے اور دوسری کو اختیار کرے، اس کا فلسفہ مذکورہ بالا دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں مذکور ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک مقولہ سے ماخوذ ہے۔

"ان الحق ثقیل مرئ وان الباطل خفیف دبئ" یعنی "حق" اگرچہ گراں نظر آتا ہے لیکن خوشگوار ہے اور اس کے برعکس "باطل" اگرچہ ہلکا پھلکا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تخمہ کر دیتا ہے۔

(وقت کے حکام)

تضاۃ الدھر قد ضلوا فقد بانت خسارتھم

وقت کے حکمران گمراہ ہو گئے ہیں اور صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔ انکی زبوں حالی اور خسارہ دنیا میں واضح ہو چکا ہے۔

فباعوا الدین بالدنیا فما ربحت تجارتھم

کیونکہ انہوں نے دین کو حقیر دنیا کے بدلے بیچ ڈالا ہے۔ سو انکی یہ تجارت سود مند ثابت نہ ہوتی۔

امام شافعیؒ کی مراد وہ جج حکام اور حکمران ہیں جو فیصلہ کرتے وقت دنیا کی محبت اور نشے میں اسلامی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اور خداوندی احکام کو مسخ کر کے ان کی جگہ اپنے تراشیدہ شیطانی قوانین نافذ کرتے ہیں۔ ان کے اس بدترین فعل سے نہ صرف ان کی آخرت ہی خراب ہوتی، بلکہ ان کا دنیوی رعب و وقار بھی خاک میں مل گیا — ان اشعار میں اس آیت کریمہ کے مضمون کیطرف اشارہ ہے:

الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً۔ یہ لوگ ہیں جنکی دنیا کی، کی کرائی محنت سب گئی گذری ہوتی اور وہ (بوجہ جہل کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ (بیان القرآن)

واضح رہے کہ امام شافعیؒ اپنے زمانہ کے حکام اور ججوں کے بارے فرما رہے ہیں، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ ہمارے موجودہ زمانہ میں احکام خداوندی اور عدل و انصاف کی پامالی کس قدر باعث شرم اور ناگفتہ بہ ہے۔ (الامان الحفیظ)

(مدارا الناس)

لما عفوت ولم احقد علی احد ارحت نفسی من ھم العداوات

میں چونکہ معاف کر دیتا ہوں اور کسی سے کینہ نہیں رکھتا۔ اس لئے میرا نفس ہر قسم کی عداوتوں سے راحت پاتا ہے۔

انی احی عدوی عند رؤیته لادفع الشر عنی بالتحیات

میں اپنے دشمنوں کو ملاقات کے وقت سلام کہتا ہوں، تاکہ سلام کے ذریعہ ان کے شر سے محفوظ رہوں۔

واظہر البشر للانسان ابغضہ کانما قد حشا قلبی محبات

اور کبھی مجھے ایک آدمی سے نفرت ہوتی ہے مگر میں اس کے سامنے خندہ روئی کا مظاہرہ اس طرح کرتا ہوں کہ گویا اسکی محبت میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

الناس داء ودواء الناس قربہم وفی اعتزالہم قطع المودات

لوگ تو ایک بیماری میں ہیں ان کی دوا ان کا قرب ہے۔ کیونکہ لوگوں سے علیحدہ رہنے میں صلہ رحمی اور محبت ختم ہو جاتی ہے۔

امام شافعیؒ نے ان اشعار میں بعض لوگوں کے اس نظریہ کی تائید فرمائی ہے کہ آدمی کے دوستوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر اور دشمن کم سے کم ہونے چاہئیں، اور یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک آدمی میں یہ اوصاف نہ ہوں: معاف کر دینا، درگذر کرنا، کسی سے کینہ اور عداوت نہ رکھنا، ہر ایک سے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا وغیرہ۔ انسان کو اپنی زندگی پرسکون بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان خصائل حسنہ کو اپنے اندر پیدا کرے۔

—(مخلص دوست)—

احب من الاخوان کل مواتی وکل غضیض الطرف عن عثراتی

مجھے دوستوں میں سے ہم رائے دوست زیادہ محبوب ہے جو میری کوتاہیوں سے چشم پوشی کرے۔

یوافقنی فی کل امر ارید ہ ویحفظنی حیا وبعد وفاتی

جو ہر کام میں میری موافقت کرے، زندگی اور موت کے بعد (دونوں حالتوں میں) میری حفاظت کرے۔

فمن لی بہذا الیت انی اصبتہ فقاسمتہ مالی من الحسنات

سو اس معاملہ میں میری کون مدد کرے گا، اے کاش! میں ایسے دوست کو پاؤں میں ایسے مددگار کو اس کی اعانت کے عوض (یا ایسے رفیق کو) اپنی آدھی نیکیاں دوں گا۔

تصفحت اخوانی وکان اقلھم　　علی کثرۃ الاخوان اھل ثقاتی

میں نے اپنے دوستوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کثرت کے باوجود لائق اعتماد بہت کم دوست ہیں ــــ

امام موصوفؒ نے ان اشعار میں جہاں مخلص دوست کی تمنا کی ہے وہاں ان خصائل و محاسن کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ جو ایک مخلص دوست میں ہونے چاہئیں۔ امام موصوفؒ نے یہاں تین بڑی بڑی صفتوں کا ذکر کیا ہے :

۱۔ دوست چشم پوش ہو، عیب جو اور افشا پرواز نہ ہو۔

۲۔ امین اور محافظ ہو، خائن اور بد باطن نہ ہو۔

۳۔ ہم ذوق اور ہم رائے ہو۔

ایسے مخلص دوست کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگانا چاہیے کہ امامؒ نے اس شخص کو اپنی نصف نیکیاں دینے کا وعدہ کیا ہے جو ان کی ایسے مخلص دوست کے پا لینے میں مدد کرے۔

ــــ(قلت مال)ــــ

یالھف نفسی علی مال افرقہ　　علی المقلین من اھل المروآت

افسوس ہے کہ میرے پاس اتنا مال نہیں جسے میں اہل مروت میں سے نادار لوگوں پر خرچ کر دوں۔

ان اعتذاری الی من جاء یسالنی　　مالیس عندی لمن احدی المصیبات

بلاشبہ اب میرا اپنے سائلوں سے یہ عذر کرنا کہ میرے پاس دینے کی کوئی چیز نہیں مصیبتوں میں سے ایک بھاری مصیبت ہے۔　　(مسلسل)

بقیہ: اسلامی معاشیات

کی آب و ہوا کے موافق ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں یہ بات ناقابل تصور ہے کہ کوئی مسلمان مسلمان ہوتے ہوئے، اسلام کا کیمیکل تجزیہ کر کے یہ ثبوت دیتا نظر آئے کہ اسلام میں اتنے فیصدی کمیونزم موجود ہے۔ یا اسلام کے تقاضے دور حاضر میں کمیونزم کے ذریعہ بہتر طور سے پورے ہو سکتے ہیں۔ آج راست روی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اسلام اور اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے۔؟ نہ یہ کہ اسلام میں کمیونزم یا کمیونزم میں اسلام کی مقدار کتنی ہے۔؟

اسلام میں اقتصادی نظام کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان ہے جس میں وہ اپنے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں کہ واقصد فی مشیک یعنی اے پیغمبر! آپ اپنی رفتار میں میانہ روی رکھیئے ــــ ۔

مقالہ ۲ پر تنقید

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، مامون کانجن۔ (لائل پور)
رکن اعزازی الحق

عمر احمد عثمانی کی تحریفات کا اجمالی جائزہ

یتیم پوتے کی وراثت

"یتیم پوتے کی وراثت" مشمولہ فکر و نظر جلد ۳ ش ۴، ۵، ۶ سے مندرجہ ذیل اقتباسات بلفظہٖ ماخوذ ہیں ۔۔ تنقید اقتباسات اور فٹ نوٹ کی شکل میں ہے ۔۔ "ادارہ"۔

مولانا مودودی کا فتویٰ[۱] فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا۔ بلکہ وارث اس کے چچا پوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں[۲] کے علاوہ کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا ہے، جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے "الخ (رسالہ ترجمان بابت ماہ مارچ ۱۹۵۲ء)
(فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۳۰۴)

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اقتباس (مع اختصار) اس لئے نقل کرنا ناگزیر ہوا، کہ فاضل مقالہ نگار نے اسی کو "طرح مصرع" قرار دیا ہے۔ اسے نقل کئے بغیر ان کے آئندہ اقتباسات کا مفہوم واضح نہ ہو سکتا۔

۲۔ بظاہر مولانا کا یہ تسامح ہے، ورنہ شیعہ حضرات، کا بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ ان کی معتبر کتب، من لایحضرہ الفقیہ، الاستبصار اور فروع کافی وغیرہ میں تصریح ہے، کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کی نقل کا ماخذ کیا ہے

بات کا بتنگڑ "مولانا موصوف نے اپنے اس جواب میں اس امر کا اعتراف فرمالیا ہے، کہ مولانا موصوف کو اپنی انتہائی کوشش[1] کے باوجود "قرآن وحدیث میں ایسا کوئی صریح حکم[2] نہ ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنیاد قرار دیا جاسکے. اور نہ صرف یہ کہ مولانا موصوف ہی کو ایسا کوئی صریح حکم نہیں مل سکا جسے فقہاء کے متفقہ فیصلہ کی بنیاد کہا جاسکے. بلکہ اس پورے بارہ سال کے عرصہ میں پورے ملک میں کسی دوسرے عالم[3] دین نے بھی آج تک نہ کوئی قرآن کریم کی صریح آیت پیش فرمائی ہے. اور نہ کوئی صریح اور صحیح حدیث نبوی، جس کے معنی یہ ہیں کہ پورے پاکستان میں کسی عالم دین کو آج تک کوئی قرآن وحدیث کا ایسا صریح حکم نہیں مل سکا. جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنیاد بنایا جاسکے (ایضاً ۲۰۶)

سلف سے خلف تک تمام امت پر تحریف کا الزام اور اس کے مبادیات

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلافت[4] راشدہ کے آخری وقت یعنی شہادت عثمانؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف[5] نہیں ہوا. وہ اس دور کو "دور اجماع[6]" کہتے

۱۔ یہ انتہائی کوشش "کا صریح پیوند مذکورہ کی عبارت سے کیسے نکل آیا.

۲۔ نفی "صریح حکم" کے ملنے کی کی گئی ہے، یا "وجود حکم کی قطعی نفی" کا دعویٰ کیا گیا ہے. جو حکم قرآن و حدیث میں صراحۃً موجود نہ ہو، بلکہ کسی آیت یا حدیث سے صحیح اصول استنباط کے ساتھ مستنبط اور "سلف سے خلف تک" تمام امت کا بلا کسی اختلاف کے اس کے استنباط کی صحت پہ اتفاق ہو آپ اسے کس "صریح دلیل" سے رد کر دیں گے.

۳۔ یہ بر خود غلط پروپیگنڈا ہے، جو فکر ونظر کے "فاضل وفقیہ مقالہ نگار" کی ذہنی غذا ہے، اس کے لئے کم از کم "بینات" دسمبر ۱۹۶۲ء اور ماہ جنوری ۱۹۶۳ء میں مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی کے عالمانہ مقالہ کا مطالعہ فرمالیا جائے، لیکن اس کا کیا علاج کیا جاسکتا ہے کہ الحاد اور زندقہ کے پردے عقل وبصیرت پر چھائے ہوئے ہیں. ع چہ کنم چشم بد خونہ کند بکس نگاہ ہے.

۴۔ اس سے کسی کو یہ وہم نہ ہونا چاہیئے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت راشدہ ۳۵ھ پر ختم ہو گئی اور یہ کہ معاذ اللہ شاہ صاحب کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت، خلافت راشدہ نہ تھی، بلکہ یہاں خلافت راشدہ سے مراد وہ خلافت خاصہ ہے، جس میں دور نبوت کی برکات پوری طرح موجود تھیں، تفصیل کے لئے ازالۃ الخفاء کا مطالعہ فرمایا جائے.

۵۔ یعنی عقاید ونظریات کا اختلاف، ورنہ فروعی مسائل کا اختلاف اس وقت بھی تھا، ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۰ باب اسباب اختلاف الصحابۃ والتابعین فی الفروع. ۶۔ یعنی جو مسائل اس دور میں بلا کسی اختلاف کے تسلیم کئے گئے. وہ مسائل "اجماعی مسائل" کہلائیں گے، آئندہ کسی کو ان میں اختلاف کرنے کی گنجائش نہ ہوگی.

تھے، اسکی تفصیل ازالۃ الخفاء میں مذکور ہے، شہادت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا اب وہی اجماع مستند ہوگا۔

لے مقالہ نگار نے امت کے اس اجماعی فیصلہ کو۔ کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ تحریف قرار دینے کیلئے، بلافہم وتدبر، شاہ صاحبؒ کی دو عبارتیں پیش کیں، ایک حضرت سندھیؒ کی روایت سے، اور دوسری خود شاہ صاحبؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے اردو ترجمہ سے، ہم نے یہ دونوں عبارتیں یہاں من وعن نقل کردیں ہیں، لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دونوں عبارتوں سے" امت کے سلف سے خلف تک" پہ تحریف کا "قرطاس ابیض" کیسے مرتب کرلیا گیا۔ کیونکہ پہلی عبارت کا مفاد صرف اتنا ہے۔ کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت خاصہ کا دور، " دورِ اجماع" کہلانے کا مستحق ہے، اس لئے اس دور میں جو مسائل محلِ نزاع نہیں بنے، ان کو" اجماعی مسائل" کہا جائے گا، اور بعد میں کسی کو یہ حق نہیں ہوگا، کہ ان میں مشاغبہ کرے، چنانچہ ازالۃ الخفاء میں ــــ جس کا حوالہ مولانا سندھیؒ نے دیا، اور مقالہ نگار کو اصل کتاب سے نقل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ٹھیک یہی بات شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

شرائع ملت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) دو قسم است، قسمے آنست کہ پردہ از روئے حقیقت وراں قسم برانداختہ شد وتکلیف ناس باں متحقق گشت، اگر کسے بشبہۂ ضعیفہ متمسک شدہ بخلاف آں قائل شود معذور نگردد، ومقلدِ آں قائل نیز معذور نہ باشد، فی الحقیقت مدارِ شریعت ہماں احکام است وتسنن وابتداع بقبول وردِ آں منوط "وعندکم من اللہ فیہ برھان۔" برہان صادق وآں ماخوذ است از صریحِ کتاب یا صریحِ سنتِ مشہورہ یا اجماعِ طبقۂ اولی، یا قیاسِ جلی برکتاب وسنت، چوں حکمے بایں وجہ ثابت شود مجالِ خلاف نماند و مخالفِ آں معذور نباشد۔
(ازالۃ الخفاء طبع جدید، ص ۲۰۰)

دینِ محمدی (صلی اللہ علی صاحبہ وسلم) کے احکام دو قسم پر ہیں، ایک قسم وہ ہے۔ کہ ان میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے۔ (شریعت نے انکو صاف کھول کر بیان کردیا۔) اور لوگوں کا ان احکام کے ساتھ مکلف ہونا ثابت ہوچکا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی کمزور شبہ کو دستاویز بنا کر ان احکام کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ قطعاً معذور نہ ہوگا، اور نہ اس کا مقلد معذور ہوگا۔ درحقیقت مدارِ شریعت یہی احکام ہیں، سنی اور بدعتی ہونا ان ہی احکام کے قبول کرنے یا رد کردینے سے وابستہ ہے، اور عندکم من اللہ فیہ برھان۔ (تمہارے پاس اللہ کی جانب سے اس میں واضح دلیل آچکی ہو) ان ہی احکام پر صادق ہے اور یہ وہ احکام ہیں جو صریح کتاب اللہ یا صریح سنتِ مشہورہ یا طبقۂ اولی کے اجماع، یا کتاب وسنت پر قیاس جلی سے حاصل شدہ ہوں چنانچہ جب کوئی

جو مذکورہ دور اوّل کے تتبع میں منعقد ہو۔ شاہ صاحبؒ اسی دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اسکی پوری تفصیل

حکم ان چار میں سے کسی ایک وجہ سے ثابت ہوگا، اس میں مخالفت کی کوئی گنجائش نہ رہے گی اور ایسے حکم کی مخالفت کرنے والا معذور نہ ہوگا۔

اس کے بعد دوسری قسم اجتہادی مسائل" کو ذکر کرنے کے بعد اگلے صفحہ پر، خلفائے راشدین کی قرشیت ان کے سوابق اسلامیہ، اور بشارت جنت کو قسم اوّل میں شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

حجۃ اللہ بر منکران آنہا قائم است و شبہات رکیکۂ ایشان عند اللہ معذور نہ ساخت ایشان را و منکر ایشان مبتدع است دور از حق "برہان اللہ" اور از بساط محمدیین صلی اللہ علی متبعہم مطرود و مقہور گردانیدہ بدعۃ مکفرۃ عند البعض و مفسقۃ عند الآخرین۔	ان امور کے منکرین پر حجت الٰہی قائم ہے، اور ان کے واہی تباہی شبہات انہیں عند اللہ معذور نہیں بنا سکتے۔ ان امور کا منکر مبتدع ہے۔ حق سے دور ہے۔ برہان الٰہی نے اسے محمدیین (صلی اللہ علی متبوعہم) کی بساط سے مطرود و مقہور کرکے باہر نکال دیا ہے۔ ان کی یہ بدعت بقول بعض موجب کفر ہے۔ اور بعض کے نزدیک بدترین فسق کی موجب ہے۔

(ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۵۸)

شاہ صاحبؒ کی ان تصریحات سے واضح ہے، کہ جو احکام طبقۂ اولیٰ میں محل نزاع و بحث نہیں رہے، بلکہ انہیں بالاتفاق تسلیم کیا گیا، ان میں اور کسی مخالف رائے کا اظہار اس دور میں نہیں ہوا وہ احکام اسی طرح قطعی ہیں، جس طرح صریح کتاب اللہ، اور صریح سنت مشہورہ سے ثابت شدہ احکام قطعی ہیں۔ ایسے احکام کی مخالفت کرنے والا شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں، بدعتی، حق سے دور، اور ملت اسلامیہ سے مطرود و مقہور کہلائے گا۔ وہ ہزاروں شبہات رکیکہ پیش کرے لیکن نہ وہ عند اللہ ان شبہات کی وجہ سے معذور ہوگا، نہ اس کے یہ شبہات کسی درجہ میں مستحق توجہ قرار دئے جائیں گے۔

اب ہم مقالہ نگار سے ان ہی کی پیش کردہ شہادت کو سامنے رکھ کر سوال کرتے ہیں کہ کیا دور نبوت اور دور خلافت راشدہ (یا مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں "دور اجماع") میں کسی پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں میراث دلائی گئی۔؟ یا کیا یہ مسئلہ دور اجماع میں کبھی نزاع و اختلاف کا نشانہ بنا۔؟ کیا ہیکل اور محمد امین مصری جیسے لوگوں نے بھی کوئی ایسا واقعہ نقل کیا۔؟ اگر نہیں (اور یقیناً نہیں) تو کیا وہ خود اپنے پیش کردہ آئینہ میں اپنی بدعت مکفرہ یا مفسقہ، حق سے دوری، اور بساط محمدیین سے مطرودیت و مقہوریت کا

ازالۃ الخفاء میں موجود ہے۔ (ماہنامہ الفرقان بریلی، شاہ ولی اللہ نمبر)

اس کے بعد خود حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ:

"اور اسبابِ تحریف میں اجماع کی پیروی ہے۔ اور اسکی حقیقت یہ ہے کہ حاملینِ دین کا ایک

بھیانک چہرہ دیکھنا پسند کریں گے۔؟

لگے ہاتھوں یہ بھی فرما دیا جائے، کہ آپ کا نام نہاد "ادارہ تحقیقات" جو صرف اجماعی مسائل کو نہیں بلکہ صریح کتاب اور صریح سنت مشہورہ کے قطعی مسائل کو بھی وقتی اور ہنگامی قرار دیکر بدل ڈالنا "کارِ ثواب" قرار دیتا ہے، شاہ صاحبؒ کے نزدیک اسکی بدعت، حق سے دوری، مطرودیت و مقہوریت، خروج از ملتِ اسلامیہ اور تکفیر عند البعض یا تفسیق اشد الفسق عند آخرین کا مقام بلند کیا ہوگا۔؟

سلہ یہ دوسری عبارت ہے۔ جو امت پر تحریف کی فردِ جرم عائد کرنے کی غرض سے مقالہ نگار نے حجۃ اللہ کے "اردو ترجمہ" سے نقل کی ہے، ہم نے اپنے ناظرین کی سہولت کے لئے اسے توسین کے ذریعہ دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں شاہ صاحب (اسباب تحریف کو شمار کرتے ہوئے) ایسے اجماع کو موجب تحریف قرار دیتے ہیں جسکی دعوت آج کل ادارہ تحقیقات اسلامی کی جانب سے دی جا رہی ہے یعنی کسی ملک۔ کے یا چند ممالک کے کچھ لوگ مل کر اگر کسی مسئلہ پر اتفاق کرلیں۔ خواہ قرآن و حدیث میں اسکی کوئی سند نہ ہو۔ تو اس کے بارے میں یہ باور کرایا جائے گا کہ ہمارے دور میں یہی دینی مسئلہ ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، کہ یہ شرعی مسئلہ نہیں ہوگا، بلکہ اسے شرعی مسئلہ قرار دینا شریعت محمدیہ میں تحریف ہے، اگر ایسے نام نہاد اجماع کو صحیح مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ چند ہی سالوں میں دین اسلام کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ اور شریعت محمدیہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

بظاہر شاہ صاحبؒ کا مقصد یعنی اسباب تحریف کا بیان کرنا۔ اتنے فقرہ سے پورا ہو جاتا تھا، لیکن ان کی "ایمانی فراست" کو فوراً تنبہ ہوا کہ کہیں ان کی اس عبارت سے کسی زندیق کو "اجماع امت" کے خلاف زہر افشانی کا موقعہ نہ مل جائے، اس لئے وہ معاً بطور استدراک فرماتے ہیں۔

(واضح رہے کہ) "یہ اجماع، اس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے"۔

اب اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ شاہ صاحبؒ "اجماع امت" کی طرف سے خود بخود وکیل صفائی پیش ہو کر اعلان فرماتے ہیں کہ "سلف سے خلف تک" کے کسی متفقہ فیصلہ اور اجماعی مسئلہ کو اسباب تحریف قرار دے کر ٹھکرا دینا نہ صرف غیر صحیح ہے، بلکہ خود تحریف کا موجب ہے، اب اس پر

فرقہ (گروہ۔ جماعت) جنکی نسبت عام لوگوں کا یہ گمان ہو کہ ان کی رائے اکثر یا ہمیشہ درست ہوتی ہے کسی امر پر اتفاق کرے، اور اس اتفاق سے یہ خیال کیا جائے کہ ثبوت حکم کے لئے یہ اتفاق قطعی دلیل ہے، اور یہ اجماع ایسے امر میں ہے جسکی قرآن وحدیث میں کوئی اصل نہیں ملتی:

(یہ اجماع اس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے، کیونکہ سب کے سب لوگ ایسے اجماع پر متفق ہیں، جسکی سند قرآن وحدیث میں ہو، یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو، اور لوگوں نے ایسے اجماع کو جائز قرار نہیں دیا جسکی سند قرآن وحدیث میں کوئی بھی نہ ہو۔) چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے، "اور جب کفار سے کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں پر ایمان لے آؤ جو خدا تعالیٰ نے نازل کی ہیں تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ ہم تو ان ہی باتوں کی

شاہ صاحبؒ کی دلیل سنیئے، فرماتے ہیں:

"کیونکہ سب کے سب لوگ" ایسے اجماع پر متفق ہیں، جسکی سند قرآن وحدیث میں ہو، یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو"

یعنی شاہ صاحبؒ پوری ذمہ داری سے اعلان کرتے ہیں، کہ امت محمدیہ کا اجماع صرف ان ہی مسائل پر ہوا ہے، اور "سب کے سب لوگ" صرف اسی اجماعی مسئلہ پر متفق ہوتے ہیں جسکی سند قرآن وحدیث میں صراحتہً یا استنباطاً پائی جاتی ہے۔ اور ایسے کسی مسئلہ پر امت متفق نہیں ہوتی جسکی سند قرآن وحدیث میں موجود نہ ہو۔ نہ ایسے اجماع کو صحیح کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک امت کے تمام اجماعی مسائل قرآن وحدیث کی صراحت یا استنباط پر مبنی ہیں، اور چونکہ استنباط کبھی خفی ہوتا ہے، اسلئے ضروری نہیں کہ کالج کے چند گریجویٹوں یا کسی مغربی قسم کی یونیورسٹی کے چند پروفیسروں کو بھی سند اجماع کا علم ہو، اور یہ کہ اجماع امت کی مخالفت براہ راست قرآن وحدیث ہی کی مخالفت ہے، اس لئے "خرق اجماع" حرام ہے، بلکہ بعض مواقع میں کفر ہے۔ (ملاحظہ ہو اکفار الملحدین فی ضروریات الدین)

اب مقالہ نگار بتلائیں کہ شاہ صاحبؒ کی یہ دونوں عبارتیں انہوں نے کس مرض کے علاج کے لئے نقل کردیں، کیا وہ شاہ صاحبؒ کی تصریح کے علی الرغم صحابہؓ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اجماع کو چیلنج کریں گے۔؟ کیا ان کی عقل یہ باور کرتی ہے، کہ تمام صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین، دین میں تحریف کے مرتکب رہے۔ اور کیا ان کے اس "خانہ ساز" نظریہ میں کوئی جان ہے۔ کہ چودہ صدیوں کی امت قرآنی حکم (پوتے کی میراث بیٹے کی موجودگی میں) کے بارے میں ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اور جب سے قلم مقالہ نگار ایسے "اہل تحقیق" کے ہاتھ آیا، تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں ان کے لئے چودہ طبق روشن ہوگئے، اور انہیں یکایک انکشاف ہوا کہ "تمام امت" تو اس مسئلہ میں غلط کار ہی رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ (اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۸۰ ۲ مطبوعہ نور محمد کراچی)

ان تصریحات کی روشنی میں ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہو گا کہ :

(۱) کیا شہادت عثمانؓ سے پہلے پہلے حضرات صحابہ کرام نے کبھی کسی مقام پر جمع ہو کر بالاتفاق اپنے اس فیصلہ کا اعلان فرمایا تھا، کہ ہم اس امر پر اجماع کرتے ہیں کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پا سکے گا، اور سارا ترکہ اس کے چچا کو مل جائیگا، اگر حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا کوئی اعلان شہادت عثمانؓ سے پہلے پہلے فرمایا تھا تو کہاں

لہ لیکن کیا انہی تصریحات کی روشنی میں مقالہ نگار اپنے اور اپنے ادارہ تحقیقات کے موقف کا جائزہ لینے کیلئے بھی تیار ہوں گے ،

لہ "اجماع صحابہ" کا مفہوم ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی دور صحابہؓ میں وہ مسئلہ بغیر کسی اختلاف کے رہا ہے، ابھی ابھی آپ کے سامنے آئے گا، کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے وارث نہ ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا، البتہ "اجماع صحابہ" کا یہ عجیب و غریب مفہوم جس کا مطالبہ مقالہ نگار فرماتے ہیں۔ یعنی "صحابہؓ کا کسی ایک مقام پر جمع ہو کر بالاتفاق اعلان کرنا" یہ بجائے خود غلط، خانہ ساز، اور مضحکہ خیز ہے۔ اس کے لئے بھی شاہ صاحبؒ ہی کی تصریح ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں :

ومعنی اجماع کہ بر زبان علمائے دین شنیدہ باشی	اجماع کا لفظ تم نے علماء کی زبان سے سنا ہو گا۔
آں نیست کہ ہمہ مجتہدان لایشذ فرد در عصر	اس کے معنی یہ نہیں کہ تمام مجتہدین سب کے سب
واحد بر مسئلہ اتفاق کنند زیراکہ ایں صورتے	کسی زمانہ میں کسی مسئلہ پر اس طرح اتفاق کر لیں کہ
ست غیر واقع بل غیر ممکن عادی۔	کوئی مجتہد بھی اس سے خارج نہ رہے۔ کیونکہ یہ صورت
(ازالۃ الخفاء ج ا ص ۶۱)	نہ صرف یہ کہ واقعہ کے خلاف ہے۔ بلکہ عادۃً ناممکن

بھی ہے۔

شاہ صاحبؒ صحت اجماع کے لئے عصر واحد کے تمام مجتہدین کے اتفاق کی شرط کو طفلانہ تصور قرار دیتے ہیں، لیکن مقالہ نگار اس میں ایک مقام پر جمع ہو کر متفقہ اعلان" کی شرط کا اضافہ فرماتے ہیں۔

لہ ازراہ کرم پہلے "اجماع صحابہ" کے مفہوم کی تصحیح کر لیجئے۔ اس کے بعد "وہ کہاں ہے کی نشاندہی" کا شغف۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں :

ا۔ وہ امر جس پر ہمارے یہاں سب کا اتفاق ہے، اور جس پر میں نے ہمارے شہر (مدینہ طیبہ) کے اہل علم کو پایا ہے۔ یہ ہے کہ پوتوں کی حیثیت وہی ہے جو بیٹوں کی ہے۔ بشرطیکہ ان سے اوپر کے درجہ

اسکی نشاندہی ہونی چاہیئے۔

۲۔ اگر ایسا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ تو اسکی سند قرآن کریم کی کونسی آیت یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کونسے ارشاد سے ملتی ہے ، یا وہ کونسی قرآنی آیت یا کونسی حدیث نبوی سے مستنبط ہے۔ کیونکہ شاہ صاحبؒ کی تصریح کے موافق اس کے بغیر فقہاء کرام کے نزدیک کوئی اجماع حجت نہیں ہو سکتا۔

میں بیٹے موجود نہ ہوں ، پوتوں کا حکم اس صورت میں بیٹوں کا سا ہے ، اور پوتیوں کا بیٹیوں کا سا۔ وہ بیٹوں کیطرح وارث اور حاجب ہوں گے۔ البتہ صلبی بیٹا اور پوتا جمع ہو جائیں۔ تو اس صورت میں میراث صرف صلبی بیٹے کو ملے گی اور پوتے پوتی کا میراث میں کوئی حق نہ ہو گا۔" (موطا امام مالکؒ)

۲۔ یہ تو امام دار الہجرت کی شہادت اپنے وطن مالوف (مدینہ طیبہ) کے تمام اہل علم (صحابہ و تابعین) کے اجماع کے متعلق ہوئی ، اب اس پر شاہ صاحبؒ نے جو مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے ، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے :

قلت :- علی ھذا اتفق اھل العلم (المسوی علی الموطا مطبوعہ مکہ مکرمہ ص ۲۶ ج ۲)

میں کہتا ہوں کہ تمام اہل علم کا اسی پر اتفاق ہے۔

۳۔ مقالہ نگار کے مسلم و معتمد علیہ قاضی شوکانیؒ تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں :

ولاخلاف ان البنین فی المیراث کالبنین مع عدمھم (ص ۳۹۶ ج ۱)

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ پوتوں کا حکم بیٹوں کا سا ہے ، بشرطیکہ بیٹے موجود نہ ہوں۔

۴۔ مقالہ نگار نے امام ابوبکر جصاص رازیؒ کی طویل عبارت تو نقل فرما دی لیکن اس کا آخری فقرہ ہضم کر گئے ، یعنی :

وھذا قول اھل العلم جمیعاً من الصحابۃ والتابعین ---- (احکام القرآن ص ۱۰۲ ج ۲)

اور (بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا) یہ تمام اہل علم یعنی صحابہ و تابعین کا قول ہے۔

یہ تین چار حوالے ہم نے صرف ان اکابر کے نقل کئے ہیں جن سے مقالہ نگار نے بار بار استشہاد کیا ورنہ ابن حجرؒ ابن تیمیہؒ ، ابن قیمؒ ، علامہ عینیؒ ، حافظ ابن حزمؒ وغیرہ تمام اکابر امت کی معتبر کتب اٹھا کر دیکھئے آپ کو اس مسئلہ میں صحابہ ، تابعین ، اور تمام امت کا اجماع ہی ملے گا ، اگر مقالہ نگار اور ان کی جماعت کو ان حضرات میں سے کسی کی نقل پر بھی اعتماد نہیں ، تو ہم "خدا حافظ" کے سوا اور کیا عرض کر سکتے ہیں ——

مقالہ نگار خدا لگتی کہیں ، کہ اگر یہی شہادتیں ان کے حق میں ہوتیں تو وہ کسی کو ان "لن ترانیوں" کی اجازت دیتے ۔؟

ہم اس سے پہلے اس مسئلہ میں اجماع صحابہ و تابعین کی شہادتیں ایسے اکابر سے جن پر مقالہ نگار کو

۳۔ اگر ایسی کوئی بات نہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔) تو کیا ایسے کسی اجماع یا اتفاق کو جس کی سند قرآن وحدیث سے نہ مل سکے۔ اور نہ ہی وہ قرآن وحدیث سے مستنبط ہو تنہا اس کے متفقہ فیصلہ کی بنا پر جائز کہا جا سکتا ہے۔

بھی اعتماد کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ——— پیش کر چکے ہیں۔ پھر اجماع امت، بالخصوص اجماع طبقۂ اولیٰ کی اہمیت بھی شاہ صاحبؒ کی تصریحات سے عرض کر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ کی جس عبارت کو سامنے رکھ کر مقالہ نگار نے امت کے خلاف تحریف کی دستاویز مرتب کی ہے، اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ کہ خود یہی عبارت اجماع امت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ ان تمام امور کے پیش نظر سب سے پہلے تو اجماع صحابہؓ کی سند کا مطالبہ ہی نادرست ہے۔ اس لئے کہ اس مطالبہ کی تہ میں یہ بدخود غلط تصور کارفرما ہے کہ صحابہ کرامؓ خدا اور رسول اور کتاب وسنت کے منشا کے خلاف پر مجتمع ہو سکتے ہیں، اسلام میں اس تصور ہی کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اس نظریہ کا حامل بقول شاہ صاحبؒ :

زندیق است، او را مے باید بقتل رسانید "زندیق ہے، اسے سزائے موت

(ازالۃ الخفاء، ص $\frac{99}{1}$) ہونی چاہیئے۔"

اور اگر (شاہ صاحبؒ کے بقول) اس زندیقانہ مطالبہ کو ایک سیکنڈ کے لئے صحیح بھی فرض کر لیا جائے، تو اس کا جواب خود ان کی اپنی عبارت میں موجود ہے، چنانچہ آگے چل کر "الاقرب فالاقرب" کی بحث میں وہ فرماتے ہیں۔ ("دوسرے اصول۔ الاقرب فالاقرب۔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیت سے مستنبط ہے، للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔") اب یہ بحث تو ابھی آگے آئے گی، کہ یہ قرآن کریم کی تصریح ہے، یا اس سے مستنبط ہے، اور یہ کہ یہ استنباط صحیح ہے یا نہیں، لیکن اتنی بات تو مقالہ نگار نے بھی تسلیم کر لی ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کی فلاں آیت سے مستنبط قرار دیا گیا ہے، پس "سند اجماع" یہی آیت ہے۔

لہ گذشتہ معروضات سے واضح ہو گیا ہو گا۔ کہ مقالہ نگار کی "ایسی کوئی بات نہیں" کی بات محض "بات بنانا ہے، مگر یہ ——— کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔

۲۔ قرآن کی سند خود ان کے اقرار سے ثابت کی جا چکی ہے، اور حدیث کی سند کیلئے "الاقرب فالاقرب" کی بحث کا ذرا سا انتظار فرمایئے۔

۴۔ کیا ایسے کسی اجماع یا اتفاق کو جو قرآن و حدیث سے مستند یا مستنبط نہ ہو حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں (کیونکہ یہ بات کسی دوسرے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی اسے شاہ صاحبؒ جیسا آدمی ہی کہہ سکتا تھا۔) اسبابؔ تحریف میں سے ایک سبب شمار نہیں کیا جائے گا۔ (فکر و نظر جلد ۳ ش ۴ ص ۳۰۸ تا ۳۱۰)

> "بے مایہ پاسنگ" کو دنیا بھر کے پہاڑوں کے ہم وزن ہونے کا خبط۔

واقعہ یہ ہے، کہ ہمارا علم و تفقہ اپنی پوری بے مائگی کے ساتھ اس علم و تفقہ کا پاسنگ بھی نہیں ہے، جو ہمارے فقہاء کرام کا حصہ تھا، لیکن اس کے باوجود ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حضرات بہر حال انسان تھے، فرشتے اور معصوم نہیں تھے، لہذا علمی دیانت

سلہ صحابہ و تابعین، اور ائمہ دین کے متفقہ فیصلہ کو تحریف قرار دینا تو "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" اور ان کے رفقاء ہی کو زیب دیتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں تو وہ "اہل اجماع" کو مفت میں بدنام کرتے ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔ ان حضرات کا قصور تو صرف اتنا ہے کہ وہ فیصلۂ خداوندی اور فیصلہ نبوت پر کیوں جمع ہے، اگر ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ تو مقالہ نگار آپؐ کے بارے میں کیا فرمائیں گے۔؟ اور خود اپنے متعلق ان کا کیا فتویٰ ہوگا۔؟ مولانا رومیؒ نے کیا خوب فرمایا تھا ــــ بے ادب محروم گشت از لطف حق ــــ ہمیں مجتہدین عصر حاضر کی حرمان نصیبی پر رحم آتا ہے۔ جو بیک جنبش قلم نہ صرف اول سے آخر تک پوری امت پر تحریف کا فتویٰ صادر کرتے ہیں، بلکہ ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لپیٹ میں لے آتے ہیں۔ قاتلہم اللہ انّٰی یؤفکون۔

۲۔ اگر یہ فقرہ مقالہ نگار کا تکلف، بناوٹ اور تصنع محض نہیں تو کیا ان کے "بے مایہ علم و تفقہ" سے دریافت کیا جا سکتا ہے، کہ جس "بے مایہ پاسنگ" کی شیخی اور تعلی میں دنیا بھر کے سر بفلک پہاڑوں کے ہم پلہ تلنے بلکہ ان سے بھاری ثابت ہونے کی خواہش چٹکیاں لے، یا جو شخص "بسلامتی ہوش و حواس" اسی "بے مایہ پاسنگ" کی غلط اندیش تعلی کے فریب میں آکر دنیا بھر کے پہاڑوں سے اسے بھاری ثابت کرنے پر ایک سو ایک دلائل پیش کر دے، ان دونوں کیلئے ادارۂ تحقیقات کے لغاتچہ میں کونسا لفظ وضع کیا گیا۔ اور اس کے پیش کردہ دلائل کا مرتبہ عقلاء کی عدالت میں کیا ہوگا۔؟ ؏ چراغ مردہ کجا و آفتاب کجا۔

۳۔ یہ بظاہر خوشنما عقیدہ اکثر زنادقہ کی طرف بکثرت دہرایا جاتا رہا ہے، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سلف سے خلف تک پوری کی پوری امت کا مجموعہ بھی مقالہ نگار کی بارگاہ عالی میں غلطی سے محفوظ ثابت نہیں ہوتا، تو ان کے واسطہ سے نقل شدہ قرآن اور اسلام دونوں کیسے محفوظ رہے ہے، اور اگر یہ دونوں بھی اپنے غیر محفوظ ناقلین کی بدولت معصوم نہیں، تو غیر معصوم پر ایمان لانے کا حکم کیوں ہے، اور کیسے ہو؟ پھر یہ سوال بھی اپنی جگہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں، کہ اگر تمام صحابہ، تابعین، فقہاء، اور پوری امت

کا تقاضا یہی ہے۔ کہ مسائل کی تحقیق میں ہم ان جذبات[۱] سے بلند ہو کر غور و فکر کریں (ایضاً صفحہ ۳۱۲)

امام ابوبکر جصاص قابل اعتماد ہیں۔ ہم نے شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی کے اقتباسات اس لئے پیش کر دئے ہیں، کہ وہ فقہ حنفی کے ایک جلیل القدر امام ہیں۔ ان کے ارشادات ہمارے علماء کرام کے نزدیک بھی مسلمات[۲] کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (فکر و نظر جلد ۳۔ ش ۵ صفحہ ۳۰۲)

آئندہ مباحث میں مقالہ نگار کی تحقیقات کا ماخذ "الاقرب فالاقرب" کی یہ بحث اور اسکی شاخیں مولانا حافظ محمد اسلم صاحب[۳] جیراجپوری کے رسالہ "محجوب الارث" سے مستفاد ہیں۔ (فکر و نظر جلد ۳ ش ۵ صفحہ ۳۰۹)

کا مجموعہ بھی معصوم نہیں تو "مقالہ نگار اینڈ کمپنی" کو فرشتہ "معصوم ہونے کا پروانہ کہاں سے اور کب سے مل گیا ہے۔؟ اور اگر مقالہ نگار اپنے اور اپنی جماعت کے لئے بھی فرشتہ معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے جیساکہ ان کی پوری مانگی سے بظاہر یہی واضح ہے۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ پوری امت کی بجائے غلط کار، تحریف کنندہ، جی چاہی کرنے والے اور "قرآنی فہم سے ناآشنا" قسم کے معزز القاب، ہم ان ہی پہ کیوں چسپاں نہ کریں۔ جن کی پوری امت کے خلاف جرح سے دین میں رخنہ اندازی کا چوپٹ کھلتا ہے،

[۱] مقالہ نگار ہمیں معاف رکھیں، یہ نری جذباتی بات نہیں۔ بلکہ شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً یہ اصولی بحث ہے، خود سوچئے کہ آج کے جمہوری دور میں پوری امت کے مقابلہ میں آپ کی تحقیقات کون قبول کرے گا۔

[۲] بلاشبہ امام جصاص کی شخصیت قابل اعتماد ہے۔ مگر جب وہی صحابہ و تابعین کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا، تو کیا وجہ ہے کہ مقالہ نگار "فقہ حنفی کے جلیل القدر امام، شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ" کی اس نقل پر اعتماد کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ لن یصلح العطار ما افسدہ الدہر۔

[۳] جب علم فرائض جیسے دقیق مباحث میں مقالہ نگار کے راہنما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین، اور فقہاء مجتہدین کی جگہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری جیسے بزرگ ہوں تو ان کی سرگردانی کی توجیہ کیا مشکل ہے۔ مقالہ نگار کی منقبت میں مدیر فکر و نظر کا درج ذیل خراج تحسین ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیے۔

"ہمارے فاضل دوست کے طرز تحریر کا امتیازی وصف یہ ہے، کہ وہ مسئلے کے ہر گوشے پر شرح و بسط کیساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی ذاتی تنقید کو ائمہ سلف کی تنقیدات کا ہمیشہ تابع رکھتے ہیں۔" جلد ۲ ش ۶

اور پھر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ:۔

وہ شیفتہ کی دھوم تھی حضرت کے زہد کی ۔۔۔ میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

تقسیم میراث کے شرعی اصول " ہمارے فقہاء کرام نے حجب کیلئے دو اصول مقرر کئے ہیں۔ ۱۔ اگر کوئی شخص مورث کیساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہو، وہ اس وقت تک حصہ نہیں پاسکتا جب تک وہ درمیانی واسطہ موجود ہو۔ ۲۔ حجب حرمان کا دوسرا اصول الاقرب فالاقرب کا ہے۔ یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔" (فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۰۷)

" دوسرے اصول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کریم کی اس آیت سے مستنبط ہے، للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون الآیۃ (مع ترجمہ) اس آیت کریمہ میں یہ دونوں باتیں خصوصیت کیساتھ غور طلب ہیں، کہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں وہ انداز بیان کیوں اختیار نہیں

اصول دوم میں صحابہ، تابعین، فقہاء مجتہدین بلکہ معاذ اللہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مراد خداوندی کو نہیں سمجھا۔

۱۔ اس بحث میں مقالہ نگار کا بیان کل تین دعووں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ الاقرب فالاقرب کا اصول قرآن کریم کی محولہ آیت سے مستنبط کہا جاتا ہے۔ ۲۔ یہ اصول ہمارے فقہاء نے نکالا ہے۔ ۳۔ یہ استنباط چونکہ قرآنی انداز بیان کے برعکس ہے اس لئے صحیح نہیں۔ آئیے ان تین دعووں پر غور کریں۔

اول ـــــ قرآن کریم کے الفاظ آپ کے سامنے ہیں، تقسیم میراث کا جو اصول قرآن کریم نے بیان فرمایا ٹھیک ان ہی الفاظ کو" الاقرب فالاقرب" کے اصول میں سے لیا گیا ہے، صرف اتنا فرق ضرور نظر آتا ہے کہ قرآن نے الاقربون کے ایک ہی لفظ (بصیغہ جمع) میں تمام اقارب کو درجہ بدرجہ لے لیا ہے، اور الاقرب فالاقرب کے اصول میں اس تدریج و ترتیب کی وضاحت کے لئے دو مفرد لفظوں کے درمیان فاء تعقیب لائی گئی ہے۔ اب اس اصول کو قرآنی لفظ کی شرح و تفسیر کہنا تو بجا ہوگا۔ لیکن اسے استنباط قرار دینا (جبکہ اس اصول میں قرآن کی اصل تعبیر کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔) مقالہ نگار ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اہل علم و دانش سے اسکی توقع نہیں کی جانی چاہیے۔

دوم ـــــ یہ دعویٰ جسے بار بار مقالہ نگار نے دہرا کر غلط تاثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ کہ یہ فقہائے کرام کا نکالا ہوا اصول ہے، قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے، یہ فقہاء کا نکالا ہوا اصول نہیں، بلکہ خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ شرح و تفسیر ہے۔ چنانچہ صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ، سنن نسائیؒ، سنن ابو داؤدؒ، جامع ترمذیؒ، سنن ابن ماجہؒ، مسند دارمیؒ، مسند احمد بن حنبلؒ، مسند امام حنیفہؒ، اور سنن دارقطنی میں مختلف، متعدد اور متواتر المعنی اسانید کیساتھ اس آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے: " الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلاولی رجل ذکر" (قرآن و سنت

فرمایا۔ جو ہمارے فقہاء نے اس آیت کریمہ سے نکالا ہے کہ " قریب ترین رشتہ داروں مردوں اور عورتوں کو اس ترکہ میں حصہ ملے گا ، جو اُن کے والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں " بلکہ اس کے برعکس یہ انداز بیان کیوں اختیار

کے مقرر کردہ حصّے ان کے مستحقین کو دیدو ، پھر جو مال باقی رہ جائے وہ قریب تر رشتہ دار مرد کا حق ہے ۔)
اس حدیث پاک میں " اولیٰ " بمعنی اقرب ہے ، چنانچہ شاہ صاحبؒ اس حدیث پاک پہ کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں

(اقول) قد علمت أن الاصل في التوارث معنيان وقد ذكرناهما وان المودة والرفق لا يعتبر الا في القرابة القريبة جداً ، كالام والاخوة ، دون ما سوى ذالك ، فاذا جاوزهم الامر تعين التوارث بمعنى القيام مقام الميت ، والنصرة له وذلك قوم الميت واهل نسبه وشرفه الاقرب فالاقرب . (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۱ ج ۲)

میں کہتا ہوں کہ یہ بات تم کو معلوم ہو چکی ہے کہ توارث کے اندر اصل دو چیزیں ہیں ، جن کو ہم بیان کر چکے ہیں ، اور یہ کہ محبت و شفقت کا صرف اس قرابت میں لحاظ کیا جاتا ہے ، جو بہت ہی قریب ہو جیسے ماں اور بھائی ، ان کے ماسویٰ میں نہیں ۔ پس جب یہ موجود نہ ہوں (یا ان کے حصص ادا کرنے کے بعد بھی مال باقی رہ جائے) تو اب توریث ، میت کے قائم مقام ہونے ، اور اسکی معاونت کرنے کے اعتبار سے معین ہوگی ، اور وہ میت کی قوم اور اس کے اہل نسب و شرافت ہیں جن میں " الاقرب فالاقرب " کا لحاظ ہوگا ۔

قرآن کریم کے لفظ " الاقربون " کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو امور کی وضاحت فرمائی ــــ
۱۔ تقویم ذوی الفروض ۲۔ اور عصبات میں الاقرب فالاقرب کے اصول کی رعایت ، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی صرف زبانی تشریح پر کفایت نہیں فرمائی ، بلکہ عملاً اسے جاری بھی فرمایا ، اور حسن اتفاق یہ کہ اس کے اجراء کیلئے صورت بھی وہی اختیار فرمائی جس میں آج کل شغب کیا جا رہا ہے ، چنانچہ مسلم شریف کے علاوہ تمام صحاح ستہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ موجود ہے ، کہ بیٹی کیلئے نصف ترکہ ہے ، پوتی کیلئے چھٹا حصہ ۔ اور باقیماندہ حقیقی بہن کا ہے " (میت کے یہی تین وارث تھے) شاہ صاحبؒ اس فیصلۂ نبوت کی توجیہ اسطرح فرماتے ہیں :

(اقول) وذالك لان الابعد لا يزاحم الاقرب فيما يحوزه فما بقى فان الابعد احق به

" میں کہتا ہوں کہ وجہ اسکی یہ ہے ، کہ ابعد (دور کا رشتہ دار) اقرب (نزدیک کے رشتہ دار) سے اس کے حصہ

فرمایا ہے۔ کہ " مردوں اور عورتوں کو اس ترکہ میں سے حصہ ملے گا ، جو ان کے والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں " نیز یہ بات کچھ کم غور طلب نہیں کہ قرآن کریم نے " الاقربین " کی موجودگی میں جو اپنے مفہوم کے لحاظ

حتی یستوفی ماجعل الله لذالك الصنف ، فالابنة تاخذ النصف كملاً ، وابنة الابن فى حكم البنات فلم تزاحم البنت الحقيقة واستوفت مالبقى من نصيب البنات ، ثم كانت الاخت عصبة لان فيها معنى من القيام مقام الابن وهى من اهل شرفه ۔ (حجۃ اللہ البالغہ صہ ۱۲۲ / ج ۲)

میں مزاحم نہیں ہو سکتا ، البتہ جو مال باقی رہ جائے ، اس کا حقدار ہے تا آنکہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس صنف کیلئے مقرر فرمایا اسے حاصل کرے ، پس بیٹی (چونکہ پوتی کی بنسبت قریب ہے اس لئے وہ) پورا نصف لے گی ، اور پوتی بیٹیوں کے حکم میں داخل تو ہے (مگر چونکہ ابعد ہے) اس لئے وہ حقیقی بیٹی سے مزاحمت نہیں کر سکتی اور بیٹیوں کا باقی ماندہ حصہ (۱/۶) حاصل کرے گی ، پھر بہن عصبہ ہے ، کیونکہ اس میں بیٹی کے قائم مقام ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں ، اور وہ میت کے اہل شرف میں سے بھی ہے ۔"

پھر قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ اصول " الاقرب فالاقرب " کی روشنی میں صحابہ کرامؓ نے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے وارث نہ ہونے کا کھل کر " اجماعی فتویٰ " دیا ، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور سلیمان بن ربیعہ کی مہر تصدیق کے ساتھ تو اسی مذکورہ بالا حدیث میں مذکور ہے ، اور حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ صحیح بخاری میں موجود ہے ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات تو تقریباً ہر خاص و عام کو معلوم ہے ، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو علم فرائض کی سند عطا کرتے ہوئے فرمایا تھا " افرضکم زید " (تم سب میں علم فرائض کے سب سے بڑے عالم زید ہیں) مگر یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگی ، کہ علم میراث کی مشکلات حل کرانے کیلئے خلیفۂ راشد امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خود بنفسِ نفیس زید بن ثابت کے در دولت پر حاضری دیا کرتے تھے ، اور ان کے فتویٰ کو سند اور حجت مانتے تھے ۔ (ملاحظہ ہو کنز العمال میراث الجد) ان حقائق کے پیش نظر فکر و نظر کے " فقیہ مقالہ نگار " سے سوال کیا جا سکتا ہے ۔ کہ " الاقرب فالاقرب " کا اصول بیچارے فقہاء کرام کا نکالا ہوا ہے ، یا صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے ۔؟ اور بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وارث قرار نہ دینے کی وجہ سے ، کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ، عبد اللہ بن مسعود ، زید بن ثابت ،

سے تمام قریب رشتہ داروں کو شامل ہے جس میں ظاہر ہے کہ والدین بھی بدرجہ اولیٰ داخل ہیں۔ "الوالدان" کی جداگانہ صراحت کو کیوں ضروری سمجھا۔ صرف "الاقربون" کے لفظ پر کیوں اکتفاء نہیں فرمایا۔ ؟ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۹ ص ۴۰۸)

ان تمام اعتراضات کی "جی چاہی" بات۔ | مسائل میراث[1] کے عمیق مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، کہ ہمارے فقہاء کرام نے یہ قانون تو مستنبط فرما لیا ہے، لیکن اس کے نفاذ میں انہوں نے کسی باقاعدگی کو مدنظر نہیں رکھا، بلکہ

حضرت عمر، ابو موسیٰ اشعری، سلیمان بن ربیعہ اور ان کے فتاویٰ کو قبول کرنے والے تمام صحابہؓ اور خود شاہ صاحبؒ پر بھی تحریف کی زبانِ طعن دراز کرنے کی جرأت فرمائیں گے۔ ؟ مقالہ نگار کا تیسرا دعویٰ یہ تھا کہ الاقرب فالاقرب کا اصول چونکہ قرآنی تعبیر "الاقربون" کے برعکس ہے، اس لئے یہ صحیح نہیں، اس کا کافی جواب تو یہ ہے، کہ یہ اصول خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے، فقہائے کرام تشریح نبویؐ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے، اس لئے مقالہ نگار کی تمام تر جرح و تنقید کا اصل نشانہ فقہاء کرام کے مقتدا ——— اور امت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرار پاتے ہیں (معاذ اللہ منہ) اور شافی جواب یہ ہے کہ اگر مقالہ نگار اتنا بھی نہیں جانتے تو ان دقیق مباحث پر خامہ فرسائی کی کیوں زحمت اٹھائی کہ قرب و بعد نسبتی تکررہ ہیں، جب آپ زید کو عمر کا اقرب قرار دیں گے، تو لامحالہ عمر و زید کا اقرب قرار پائے گا، پس اگر بیٹا، پوتے کی نسبت اقرب الی المیت ہے، تو میت بھی پوتے کی نسبت بیٹے کی اقرب ہوگی، یہ عجیب و غریب فلسفہ کسی نے کب سنا ہوگا، کہ بیٹا تو بلاشبہ اقرب ہے، لیکن مرنے والا اپنے بیٹے کا اقرب نہیں، بلکہ اس کا قرب بیٹے اور پوتے کیساتھ یکساں ہے۔ — اس سے معلوم ہو گیا ہوگا، کہ مورث کو اقرب کہا جائے، یا وارث کو دونوں کا مآل صرف ایک ہے، البتہ جہاں علتِ توریث کو ذکر کیا جائے گا۔ وہاں مورث کی اقربیت ذکر کی جائیگی اور جہاں علتِ توارث کا ذکر چھڑے گا وہاں اقربیت وارث کا ذکر ہوگا۔

[1] مسائلِ میراث کا عمیق مطالعہ تو جیراجپوری صاحب کے محجوب الارث سے استفادہ ہی سے ظاہر ہے، رہا فقہائے کرام کے بارے میں "جی چاہا" کا افسانہ اسکی حقیقت سابقہ معروضات سے کھل گئی ہوگی، مقالہ نگار کے وارد کردہ نقوض کا حل بھی ان ہی گذارشات سے بادنیٰ تامل معلوم کیا جاسکے گا ورنہ نادان کیلئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

جہاں ان کا جی چاہا" اس قانون کو نافذ فرمالیا اور جہاں ان کا جی چاہا اسے نظر انداز کر دیا۔ (جلد ۳ ش ۶ ص ۲۰۸)

الاقرب فالاقرب کا ماڈرن مفہوم | اگر اس قانون کو صحیح ماننا ہے تو ہمیں اس کا ایسا مطلب لینا ہوگا جس سے یہ قانون ہر جگہ فٹ بیٹھ جائے۔ اس لئے لازماً اس قانون کا یہی اور صرف یہی مطلب لینا ہوگا کہ "اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلا واسطہ میت سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ رشتہ رکھتا ہو، لیکن مورث کی وفات کے وقت وہ واسطہ باقی نہ رہا ہو" (ص ۲۱۵)

نتیجہ! نتیجہ !! نتیجہ !!! | لہٰذا ہم نہایت دیانتداری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ یتیم پوتوں کی اپنے دادا کی وراثت سے محرومی کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں ہے، لہٰذا ہمیں اپنی فقہ کی اس فروگذاشت کو تسلیم کر کے ان مظلوموں کیساتھ انصاف برتنے میں کسی قسم کی "علمی عصبیت" کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہئے، اور ہمیں کھلے دل کیساتھ تسلیم کر لینا چاہئے کہ یتیم پوتے اپنے دادا کی میراث سے حصہ پانے کے ہر اعتبار سے مستحق ہیں۔ انتہی (ص ۲۱۷ آخری فقرہ)

۱۔ مقالہ نگار قرآن وسنت اور اجماع صحابہ کے مقرر کردہ اصول کو صحیح مانیں یا نہ مانیں یہ ان کا اپنا ایمانی معاملہ ہے۔ البتہ فٹ آتی پھانسی دنیا عقلاء جانتے ہیں کہ کہاں ہوتا ہے۔

۲۔ مقالہ نگار صاحب جیراجپوری صاحب کی تقلید میں کتاب وسنت، صحابہ وتابعین، اور فقہاء مجتہدین کے اعتماد کو تو جواب دے ہی چکے تھے، لیکن "الاقرب فالاقرب" کا ماڈرن مفہوم بیان کرنے بیٹھے تو ہدایت عقلیہ کو بھی خیر باد اور خدا حافظ کہہ گئے، یعنی یہ اقرار ہے کہ بیٹا بلا واسطہ رشتہ دار ہے۔ اور پوتا بالواسطہ رشتہ رکھتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اصرار ہے۔ کہ عقل وخرد کے علی الرغم ان دونوں کو ایک ہی درجہ میں "اقرب" قرار دیا جائے، عجب نہیں کہ ان کی اس تحقیق پر یتیم پوتوں کو بھی ہنسی آجائے۔

۳۔ مقالہ نگار کی "نہایت دیانتداری" سر آنکھوں پر، لیکن معاف کیجئے ہم اس سے پہلے "نہایت دیانتداری" کیساتھ قسمیں کھانے والے کے فریب کو آزما چکے ہیں۔ (وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین) اس لئے ہم خدا ورسول کے احکام کے مقابلہ میں نہ تو کسی کی "نہایت دیانتداری" پر اعتماد کرنے کی ہمت رکھتے ہیں، نہ کسی کی عقل وخرد پر۔

۴۔ فقہ اور فقہاء کی فروگذاشت نہیں بلکہ جرأت سے کام لیجئے اور اسلام اور صاحب اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرضی فروگذاشتیں لوگوں کو تسلیم کرائیے، کیونکہ فقہاء کرام تو محض صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سر وچشم کی تعمیل کر رہے ہیں، ان بے چاروں پر برسنا تو ایسا ہی ہوگا، کہ زید کی عداوت میں اسکے نشان قدم کو پیٹنا شروع کر دیا جائے۔

۵۔ لیکن کیا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین نے ان فرضی مظلوموں کو محروم کر کے انصاف نہیں کیا۔؟

۶۔ فقہاء پر "علمی عصبیت" کا الزام مقالہ نگار کو مبارک ہو، یہ علمی عصبیت نہیں۔ بلکہ ایمانی تقاضا ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اسلام کا نظامِ معاشیات

مولانا انوار الحق صابر کاکاخیل

دنیوی راہوں سے آمدہ نظام ہائے معیشت میں سے کیپٹل ازم کی ابتداء انگلستان سے ہوئی، اور آہستہ آہستہ یہ تمام یورپ پر چھا گئی۔ گو مغربی ممالک اس وقت باہم مسابقت میں رقیب نظر آتے ہیں۔ مگر امریکہ ہو یا برطانیہ، اٹلی ہو یا جاپان آج وہاں کے کل نظام معیشت ایک ہی صورتِ سرمایہ داری کے مختلف رنگ ہیں۔ جیسے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ؂

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جسکے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

کیپٹل ازم یعنی وہ سرمایہ دارانہ نظام تسلطائیت جس میں ذرائع پیداوار مخصوص طبقے کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس میں انہوں نے پہلے پہل ہاتھ سے ہی چلنے والے نجی کارخانے کھولے اور قوانین کی مدد

سے کچھ دولت کمائی پھر اٹھارویں صدی کے آخر میں آہستہ آہستہ دستی کارخانوں کی جگہ مشینری کارخانوں نے لے لی، دستکاروں اور دستکاریوں کا خاتمہ شروع ہوا اور اس طرح چھوٹے تاجر افلاس سے مجبور ہو کر مشینری کارخانوں میں مزدور بنے اور اپنی محنت کو کم سے کم قیمت پر بیچ کر کارخانہ دار بننے کی بجائے مالکِ مشین کے غلام بنے اور مشینوں کے باعث جب کم سے کم اُجرت پر زیادہ سے زیادہ مال تیار ہونے لگا۔ اور گوداموں میں مال کی فراوانی ہونے لگی اور ساتھ ہی ملک کے مزدور اور غریب عوام کی قوتِ خرید کم ہوئی تو فراوان پڑا ہوا مال سڑنے اور خراب ہونے سے بچانے کی فکر میں مغربی ممالک دوسرے ممالک پر حرص و آز کی نگاہ ڈالنے لگے اور مرضِ جوع الارض میں گرفتار ہوئے۔ اور اس طرح نئی منڈیوں کی تلاش میں آج تک ان اقوام کی باہمی مسابقت جاری ہے۔ اور اس تگ و دو کے نتیجہ میں مغربی طاقتوں کی ان اقتصادی رقابتوں کے باعث ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی شکل میں ہلاکتِ عالم اور ظهر الفساد فی البر والبحر کا نقشہ سامنے ہے۔ فسطائیت کے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے مقابلہ پر اسلام کے اقتصادی نظام کو سامنے رکھئے تو صاف پتہ چلے گا کہ ــــ

ــــ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔

اسلام میں بھی پیداوار اور اس کے ذرائع میں انفرادی ملکیت جائز ہے۔ مگر ایک حد تک اور اس شرط کے ساتھ کہ وہ اجتماعی مفاد سے کسی طرح ٹکرانے نہ پائے بلکہ اس کے لئے تقویت کا باعث ہو ــــ

اسلام کے اقتصادی نظام میں دولت اور ذرائع دولت کا مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر عوام کے معاشی ہلاکت کا باعث بننا حرام ہے۔ اسلام میں انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق کے زیرِ اثر ہے۔ چونکہ اسلامی اقتصادیات کی بنیاد عوام کے مفاد اور حاجات کے انسداد پر قائم ہے۔ اس لئے اسلام اکتناز (یعنی جمع خزانہ) و احتکار (اجتماعی حقوق سے بار رہے) کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ اسلام نے اپنے اس نظام کی بقا کے لئے قانونی اور اخلاقی دونوں طرح کے موثر طریقے اختیار کئے ہیں۔

چنانچہ اسلامی نظام میں ایک طرف سُود، نشہ آور اشیاء کی خرید و فروخت۔ نجس اشیاء کی بیع و شراء، جوا اور قمار کی طرح کے کاروبار کو ممنوع قرار دینے کے احکام اور قوانین پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف مذموم سرمایہ داری کے استیصال کے طور احتکار و اکتناز کی جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ بیدار کرنے کی اخلاقی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ اسی طرح اگر اسلامی نظامِ معیشت میں جاگیرداری کے ظالمانہ رسم و رواج کا انسداد اور زکوٰۃ، عشر، صدقاتِ واجبہ، خراج اور وراثت کے لزوم کے بہترین

قواعد اور اصول مقرر رہیں تو اس کے ساتھ ساتھ مضاربت، ہبہ، وصیت، قرضِ حسنہ، عاریت، امانت، صدقاتِ نافلہ، اوقاف اور عقدِ شراکت کے ذریعہ باہم تعاون اور دوسروں کے ساتھ اخوت و ہمدردی کے عمدہ اخلاقی اقدار کو اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں موثر جگہ دے کر کائناتِ انسانی کی فلاح عام کا بیڑا اٹھایا۔ بلکہ تمام ایسی راہیں بند کر دینے کی کوشش کی جن سے عوام کی تباہی و بربادی پر خواص کی مالی سربلندی کی عمارت تعمیر ہو ـــــ

دنیوی راہوں سے آمدہ نظام ہائے معیشت میں سے سوشل ازم دوسرا اہم اور قابلِ توجہ نظام وہ ہے، جو آج کمیونزم اور اشتراکیت کے نام سے دنیا میں انقلاب برپا کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس کی ابتداء کیپٹل ازم کے ری ایکشن اور ردِ عمل کے طور ہوئی۔ جب سرمایہ دارانہ نظام کے ظالمانہ دستبرد نے ایک طرف مزدور طبقہ غریبوں اور فاقہ کش عوام میں بیداری اور شعور کا جذبہ پیدا کر دیا۔ سب نے حقوق کے نام سے شور اور واویلا شروع کیا۔ انجمنیں بنائیں اور بغاوتیں شروع کیں تو دوسری طرف اٹھارویں صدی کے آخر میں پہلے پہل ہیگل اور پھر فریڈرک کے مادی ذہن نے دنیا کے تمام انسانوں کو پیٹ اور روٹی ہی کے مسئلہ پر اکٹھا کر سکنے کا تصور گڑھ لیا۔ اور پھر اقتصادی امور میں بنیاد قرار دیکر کارل مارکس نے اس علمی نظریہ کو عملاً تمدنی پروگرام کی شکل دی ـــــ

اس نظام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مفادِ عامہ کا داعی اور مزدوروں، کسانوں اور پسپت و مظلوم طبقوں کا حامی ہے۔ یہ نظام دولت اور ذرائعِ دولت سے انفرادی ملکیت کو مٹانے اور بہ لحاظِ معیشت اختلافِ درجات کے انکار یعنی معاشی لحاظ سے بھی سوسائٹی میں مساوات تسلیم کرنے کا قائل ہے۔ نیز فلسفۂ اشتراکیت میں خدا سے انکار اور الٰہیات کی نفی بھی صفِ اوّل میں جگہ پاتے ہیں۔

انفرادی ملکیت کے کلی خاتمے، تمام افراد میں کامل معاشی مساوات قائم کرنے اور مزدور راج کے قیام کے اشتراکی پروگرام میں کمیونسٹ چالیس پچاس سال کی محنتوں کے بعد کس حد تک کامیاب ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ جس جس سرزمین میں اس کا مکمل تجربہ کیا گیا ہے، وہاں مسلسل بیش بہا قربانیوں کے باوجود یہ پروگرام تاحال ناکام ہی رہا ہے۔ اور آئندہ بھی اس پروگرام میں انسانی سکھ کا مداوا ڈھونڈنا نری حماقت ہے۔ دراصل قومی ملکیت کا تصور اور انفرادی ملکیت کا خاتمہ انسانی فطرت سے فرار کی غیر فطری راہ ہے ـــــ

کمیونزم کے نزدیک انسانیت کا پورا کنبہ ایسے بے وقوف جانوروں پر مشتمل ہے، جن کے ہاتھوں میں اگر سرمایہ اور وسائل کی طاقت سونپ دی جائے تو وہ لازماً اسے اپنی نوعی برادری کو نقصان

پہنچانے ہی میں استعمال کرے گا۔ ظاہر ہے۔ کہ انسانی فطرت سے اس حد تک کی مایوسی محض ایک ہیجانہ جذبہ ہے، جسے اسلام کی فطرتِ سلیمہ بہ طیبِ خاطر قبول نہیں کر سکتی۔ اسلام تو انسان کو پیدائشی گنہگار نہیں سمجھتا، جس سے انسان دشمنی کے طرز وطور کے سوا کسی بلند اخلاق کی توقع نہ رکھ سکتے ہوئے انہیں جانوروں کے غول سمجھ کر ان سے ملکیت کا حق سلب کر لیا جائے جس فلسفہ میں انسان کو انسان کے شر سے بچنے کے لئے اس کے ہر فرد کی ناک میں سٹیٹ کی رزاقی کی نکیل ضروری ہو اُسے انسانیت کے ذلیل فلسفے کے سوا دوسرا کوئی نام دینا بھی شرافت سے بعید ہے۔ کسی انسان کا دن بھر مالک کے اشارہ پر مشقت کر کے شام کو نپا تلا چارہ وصول کر لینا کسی معاشرے میں انسان کو دھوبی کے بیل، کمہار کے گدھے اور تانگے کے گھوڑے کی حیثیت دینے کے مترادف ہے۔ نیز ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسانی فطرت سے مایوس لوگوں نے بھی دولت اور ذرائع دولت کو قومی ملکیت قرار دینے کے بعد مرکزی خزانے اور اس کی تقسیم کے انچارج بنانے کیلئے آسمان سے فرشتوں کو درآمد نہیں کیا ہے بلکہ وہ بھی تو بالآخر اس سلسلہ میں انہی انسانوں میں سے چند افراد کو اس کا نگہبان بنا چکے ہیں جن کے متعلق ان کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ وسائلِ معاش کے انفرادی مالک بن کر یہ موجبِ شر ہی ہوں گے۔ قومی ملکیت زیرِ اثر ملک میں کارخانے، زمینیں اور سرمایہ کی ہر شکل کے ساتھ ساتھ جب پریس اسٹیج اور اظہار رائے کا ہر ذریعہ بھی قومیانہ ہو تو وہاں اگر مثلاً حکومت کے بڑے زیادتیوں پہ اتر آئیں تو حقیقی معنوں میں اس کی روک تھام ناممکن ہی ہو جاتی ہے۔

قومی ملکیت کے اصول پہ قائم شدہ اشتراکی حکومت کے خواص کی فطرت میں تشدد اور وہاں کے عام کارکن کے ایک بے جان آلۂ کار ہونے کا تصور ایک بھیانک تصور ہے۔

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت رکھنے والے ممالک میں جو فطرت سرمایہ دار افراد کی ہوتی ہے۔ ٹھیک وہی فطرت قومی ملکیت رکھنے والے سٹیٹ کی خود بن جاتی ہے، کہ بظاہر تو وہ تمام سرمایہ داروں کو نگل لیتی ہے۔ لیکن وہ خود ایک ایسا سرمایہ بن جاتا ہے جس سے مقابلہ کرنے والی کوئی دوسری طاقت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی ۔۔۔ قومی ملکیت کی آدم کشی کا باقی حال اُن ممالک کے صنفِ نازک اور اُن کے بچوں سے پوچھنا چاہئے جہاں ماں متا سے مجبور کوئی ماں کارخانے میں حاضری دینے سے اُس وقت تک مستثنیٰ قرار نہیں پا سکتی جب تک وہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے ذریعے بچے کے پاس موجود رہنے کی اہمیت ثابت نہ کر دے۔

کامل معاشی مساوات کا نعرہ کمیونزم بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے مترادف ہے۔

وہاں سٹالن کا معیارِ زندگی تو ٹرومین کے ہم پلہ ہے۔ لیکن اس کی امت کے افراد امریکہ کے مزدور کے
برابر معیارِ زندگی نہیں رکھتے ہیں۔ روس کی جنتِ مساوات میں روز کی روٹی روز کمانے والے بھی ہیں،
مگر ساتھ ہی وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کی بچتیں کئی کئی ہزار روبل کی مقدار میں بنکوں میں موجود ہیں۔ روس کی
جنت مساوات میں پیدل چلنے والے اور کاروں کے مالک پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ جب
قدرت کی جانب سے دماغی اور جسمانی صلاحیتیں مساوی نہیں تو ان کی مساعی کیسے ایک جیسی ہو سکتی
ہیں اور جب مساعی برابر نہ ہوں تو ان کے نتائج میں برابر برابر کی حصہ داری کو غیر فطری مساوات
ہونے کے باعث کسی منطق سے بھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

انفرادی ملکیت کی حرمت اور قومی ملکیت کی حلت کے قائل ممالک کا یہ نعرہ بھی بڑا
دل فریب ہے کہ وہاں مزدوروں کا راج ہے۔ ان کا یہ نعرہ کھوکھلا اس لئے ہے کہ وہاں کے مزدور
اس میں شک نہیں کپڑا بننے اور جہازوں کے پرزے بنانے کی مشین تو ضرور چلا رہے ہیں۔ لیکن
حکومت کی مشین چلانے میں محض اس حد تک ان کا ہاتھ ہوتا ہے کہ انہیں بھی امریکہ میں عوام کے راج
کی طرح بس اتنا اختیار ہوتا ہے کہ "تم ووٹ دو" تاکہ تمہارے ووٹوں کے بل پر ہم راج کریں۔ اس
طرح وہاں جو ووٹ دینے کے لئے ہیں وہ بس صرف ووٹ ہی دیتے ہیں۔ اور جو راج کرنے کیلئے
ہیں وہ راج کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظامِ معیشت کے بلند بانگ دعوؤں کی حقیقت آپ
کے سامنے ہے۔ اس لئے ہمیں بجا طور پر اب یہ کہنے کا حق ہے کہ انسانوں کے خود بنائے ہوئے
نظام چاہے ان کے کتنے ہی مختلف نام اور کتنے ہی مختلف ڈھانچے ہوں ایک ایسے مجموعے
کے اجزاء ہیں، جن کا نام اسلامی اصطلاح میں "جاہلیت" ہے۔ یہ تمام نظام وقتی اور عارضی قدروں
کو لیکر نئے نئے پیرایوں میں جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے ہر ڈھانچے کو تجربہ تھوڑی مدت میں
ناکارہ قرار دے کر میدانِ تاریخ سے خارج کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک نئے ڈھانچے کی تعمیر شروع ہو
جاتی ہے۔ ان میں نہ تو توازن ہے نہ اعتدال بلکہ ان کی نشو و نما افراط و تفریط کی فطرت سے ہوتی ہے۔
اس لئے یہ اپنی حدود کو آگے پیچھے کرنے پر بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں، بخلاف اس کے اسلام کے
اقتصادی نظام کا ڈھانچہ کہ اس کا سرچشمہ علمِ خداوندی ہے۔ اس میں دولت اور ذرائع دولت میں
انفرادی ملکیت مسلّم ہے۔ اس میں حقِ معیشت کی مساوات کا اعتراف ہے۔ اس میں بلحاظِ معیشت
اختلافِ مدارج کا اقرار ہے۔ اس کی اخلاقی قدریں دوامی ہیں۔ وہ رہتی دنیا تک ہر زمانے اور ہر ملک

باقی ص ۲۹ پر

هٰذِهٖ قَصِیْدَۃٌ حَقَّانِیَّۃٌ جَرٰی مِنَ الْقَلَمِ انْتِصَارُ الْحَقِّ الْحَقِّ جَلَّ مَجْدُهٗ لَعَلَّ کَلِمَۃً مِّنْهَا یَقَعُ فِیْ مَعْرِضِ الْقَبُوْلِ

رشحاتِ فکر مولانا قاضی عبدالسلام صاحب خلیفہ حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانویؒ

★ حَمْدُ الْحَقِّ تَعَالٰی عَنْ مُّحَاکِیْهِ

ثنا ہے اس حق تعالیٰ کی جو محاکات اور مشابہت سے بہت اونچا ہے۔

★ حَقَّ الْمَقَالُ فَکُلُّ النَّاسِ یَجْتَنِیْهِ

بات جب حق ہوتی ہے تو تمام لوگ اس کو مقصد بنا لیتے ہیں۔

★ لِلْحَقِّ کَانَ سَمِیْعًا عَبْدُهٗ اَبَدًا

حق کا بندہ ہمیشہ حق کو قبول کرنے والا ہی رہا ہے۔

★ فَحَقَّ لِلْحَقِّ اَنْ یُّعْلٰی مَعَالِمُهٗ

اور حق ہے یہ حق کا کہ اس کے نشانوں کو اونچا کیا جائے۔

★ وَاِذْ فَشَا الْکِذْبُ وَانْشَبَّتْ مَخَالِبُهٗ

اور جب جھوٹ عام ہوگیا اور مضبوط ہو گئے پنجے اس کے۔

ثُمَّ الصَّلٰوۃُ عَلٰی حَقٍّ یُّدَانِیْهِ

پھر درود ہے اس حق پر جو (مخلوق میں سے) اس کے قریب ہے۔

وَکُلُّ مَنْ یَّبْتَغِیْ بِالْحَقِّ یُرْوِیْهِ

اور جس شخص نے حق کو طلب کیا وہ حق اس کی پیاس کو بجھائیگا۔

مَنْ یَّسْمَعِ الْحَقَّ یَعْرِفْ حَقَّهٗ فِیْهِ

جو کوئی حق کو قبول کرے گا وہ اپنا حق اس حق کے متعلق پہچان لے گا۔

وَالْحَقُّ یَعْلُوْ مَقَالُ الْمُصْطَفٰی فِیْهِ

اور حق اونچا ہی رہتا ہے یہ فرمانِ مصطفیٰ ہے حق کی شان میں۔

فِیْ زِیِّ حَقٍّ فَحَقُّ الْحَقِّ یُزْرِیْهِ

حق کے لباس میں تو حق کا حق اسکو عیب لگا کر چھوڑے گا۔

★ دَارَ الزَّمَانُ وَعَزَّ الْحَقُّ فِیْ ظُلَمِہٖ
گھوم گیا زمانہ اور حق اندھیروں میں نایاب ہو گیا۔

وَقَلَّ اَعْوَانُہٗ مَنْ کَانَ یَدْرِیْہٖ
اور کم ہو گئے اس کے امداد کرنے والے جو اس کو جانتے تھے۔

★ وَصَارَ صَاحِبُہٗ ضَاقَتْ مَعَائِشُہٗ
اور حق والا ایسا ہو گیا کہ اسکی زندگی کے علائق تنگ ہو گئے۔

کَاَنَّہٗ جَمْرَۃٌ قَدْ حَلَّ فِیْ فِیْہٖ
گویا یہ حق ایک چنگاری ہے جو اس کے منہ میں اتر گئی ہے۔

★ دَاءُ الْعِنَادِ اَحَاطَ الْعَقْلَ غَیْھَبُہٗ
عناد حق کی مرض ہے جسکی گھٹا نے عقل پہ احاطہ کیا ہے۔

وَاَبْطَلَ الْحِسَّ وَالْاِدْرَاکَ قَاضِیْہٖ
اور حس و ادراک کو عناد کے قاضی نے باطل کیا ہے۔

★ وَالنَّاسُ مَرْضٰی وَلَا یَدْرُوْنَ دَاءَھُمْ
اور لوگ تو ایسے مریض ہیں جو اپنے مرض کو نہیں پہچانتے۔

فَذُوْ نَصِیْبِ الْحَقِّ مَنْ یَّقْدِرُ یُدَاوِیْہٖ
تو سوا حق والے کے کس کو قدرت ہے جو ان کی مرض کی دوا کرے۔

★ مَنْ یَّنْصُرِ الْحَقَّ فَالرَّحْمٰنُ یَنْصُرُہٗ
جو کوئی حق کی امداد کرے رحمٰن پاک اسکی امداد فرمائے گا۔

مَا شَاءَ مِنْ فَضْلِہٖ یُعْطِیْہِ یُرْضِیْہٖ
جو چاہے اپنے فضل سے اسکو دیگا راضی فرمائے گا۔

★ یَا قَاضِیْ ھٰذَا عَطَاءٌ مِّنْ خَزَائِنِہٖ
اے قاضی یہ حق کی امداد اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ایک عطا ہے۔

مَنْ نَّالَہٗ فَازَ فَلْیُوْفِ اَمَانِیْہٖ
جو اس عطا کو پا گیا بامراد ہو گیا تو ضرور اپنی خواہشات پوری کرے۔

کراچی۔ کے ڈی اے کی نام تجویز کرنے والی کمیٹی نے ناظم آباد کی شاہراہوں اور سڑکوں کے نئے نام تجویز کئے ہیں۔ یہ نام جنگ آزادی اور جہادِ حریت کے نامور اور ممتاز قائدین اور مشاہیر کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ان سڑکوں اور گلیوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں :— شارع قاسم نانوتویؒ۔ شارع حاجی امداد اللہؒ۔ شارع محمود الحسنؒ۔ شارع عبید اللہ سندھی۔ شارع رشید احمد گنگوہی۔ شارع اشرف علی تھانویؒ۔ شارع شاہ اسحٰق دہلویؒ۔ شارع رحمت اللہ کیرانویؒ۔ شارع فضل حق خیرآبادی۔ شارع سلیمان ندویؒ۔ شارع عبدالباری فرنگی محل۔ شارع عطاء اللہ شاہ بخاریؒ — شارع عبدالرحیم سندھیؒ۔ شارع مولانا محمد علی جوہرؒ۔ شارع شوکت علیؒ۔ شارع ثناء اللہ امرتسریؒ۔ شارع مولانا محمد صادقؒ۔ شارع حبیب الرحمان شیروانیؒ۔ (روزنامہ حریت کراچی ۵ مارچ ۱۹۶۷ء)

ادبیات

نتیجۂ فکر نواب میر عثمان علی خان نظام مرحوم

مرسلہ : مولانا غلام محمد بی۔ اے۔ کراچی

نظام الملک آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں مرحوم آخری تاجدارِ دکن، گوناگوں کمالات کے مالک تھے جدید و قدیم علوم میں انہیں کامل دستگاہ حاصل تھی، اور جذبۂ دین سے وہ سرشار رہتے، ان کے دینی اتالیق حضرت مولانا محمد انوار اللہ خاں (الملقب بہ فضیلت جنگ) رحمۃ اللہ علیہ ایک کثیر التالیف متبحر عالم اور مدرسہ نظامیہ دکن کے بانی ہونے کے علاوہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز تھے، حضرت ممدوح کی خصوصی توجہ نے نظام سابع میں وہ دینی ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا جو عالم آشکارا ہے۔ اور اس دور کے مسلم حکمرانوں میں اسکی نظیر ناپید ہے۔ یہ معلوم کر کے مزید مسرت حاصل ہوئی کہ میر عثمان علی خان نے آخر دنوں میں رجحان شیعیت سے توبہ کر لی تھی، اور وصیت کی تھی کہ اہل السنت والجماعت مسلک کے مطابق آخری سامان کئے جائیں، چنانچہ شہر کی جامع مسجد میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور سنی حضرات نے تدفین وغیرہ کے فرائض انجام دئے، یہ حضرت مولانا انوار اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ کی توجہات کا کرشمہ ہوگا کہ بظاہر انجام بخیر ہو گیا۔ نظام سابع کو ذاتِ رسالت پناہ سے عشق تھا، انہوں نے سرشاریٔ عشق میں نعتیں بھی کہیں ہیں جو ان کو نعت گو شعراء میں ایک مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ نعتیں محض عشق و محبت کا مرقع ہی نہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض فنی اعتبار سے بھی نہایت معیاری ہیں۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ انہوں نے فنِ شاعری میں استاذ سخن جلیل مانکپوری ثم حیدرآبادی (المخاطب بہ فصاحت جنگ) سے تلمذ حاصل فرمایا تھا جو مقبول و مشہور نعت گو شاعر امیر مینائی کے جانشین تھے ـــــ نظام سابع کی دو نعتیں ایک فارسی اور ایک اردو اہلِ ذوق کی ضیافت کے لئے پیش ہیں ـــــ

بنہ بر پائے احمد سر کہ یابی صد وقار ایں جا
زر ایں جا گوہر ایں جا حشمت ایں جا افتخار ایں جا

بہ طیبہ چوں در آیم با ہزاراں شوق بر خوانم
من ایں جا، زندگی ایں جا اجل ایں جا، مزار ایں جا

ز داغِ عشق سرور سینہ گلزار جناں دارم
گل ایں جا، لالہ ایں جا، سنبل ایں جا، نو بہار ایں جا
زہے مستی کہ باشد در خیالِ ساقیؐ کوثر
خُم ایں جا، جام و مے ایں جا، سرور ایں جا، خمار اینجا
نباشد جائے من جز آستانِ مصطفیٰؐ عثمانؔ
سر ایں جا، سجدہ ایں جا. بندگی ایں جا، قرار ایں جا

ہے فخرِ رسل انجمن آرائے مدینہ
مولائے جہاں ہے مرا مولائے مدینہ

زاہد کو ہوائے چمنِ خلد مبارک
ہم جان سے رکھتے ہیں تمنائے مدینہ

آنکھوں میں کھینچے عالمِ لاہوت کا نقشہ
دل سے جو کوئی دیکھے تماشائے مدینہ

اے اہلِ نظر غور سے دیکھو تو ذرا تم
تصویر کا عالم ہے سراپائے مدینہ

ہے طائرِ سدرہ بھی ہوا خواہ ہمارا
جس روز سے ہم بن گئے شیدائے مدینہ

کیا آنکھ پڑے گلشنِ ہستی کی فضا پر
ہے اپنے مقابل رخِ زیبائے مدینہ

اِک سلسلۂ گیسوئے محبوب ہے یہ بھی
رہتا ہے مرے سر میں جو سودائے مدینہ

غیرت دہِ صد برقِ تجلی گل طیبہ
رشکِ شجرِ طور شجر ہائے مدینہ

ہر دم دلِ مشتاق رہے محوِ نظارہ
اے کاش یہ سینہ مرا بنجائے مدینہ

یثرب کے ہر اک ذرہ میں محبوب کا دیدار
دیکھوں جو مقدر مجھے دکھلائے مدینہ

اے بادِ صبا خاک کو عثمانؔ کی پس مرگ
لیجا کے اڑا دے سرِ صحرائے مدینہ

مکتوبِ حرمین الشریفین

دیار حبیب کی باتیں

از مکہ مکرمہ
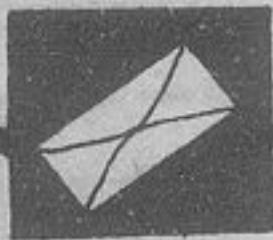
مولانا شیر علی شاہ صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ

—— اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس روسیاہ کو اپنے در تک رسائی بخشی۔ یہ محض اسکی ذرہ نوازی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب ادام اللہ اظلالہم کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ راستے کی تمام تکالیف اور سفر کے متاعب و موانع ختم ہو کر بالآخر خانہ کعبہ کی دید سے دیدۂ قلب و جگر کو مسرت و انبساط نصیب ہوئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنے گھر سے خدائے عزوجل کے مقدس گھر تک گیے اور کن حالات میں پہنچا۔ ناامیدی اور پریشانیوں کے سیاہ بادلوں نے کئی دفعہ مغموم و محزون بنایا۔ مگر یہاں پہنچ کر تمام کلفتیں اور مشقتیں بھول گئی ہیں۔ بلکہ درحقیقت راستے کے یہ مصائب و متاعب شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی بدولت دل کی دیرینہ تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔

حج قرآن کے جملہ مناسک بفضلہ تعالیٰ بحالت صحت و عافیت ادا کئے۔ موسم بہت اچھا رہا۔ عرفہ کے دن صبح سے کر شام تک بادل رہے۔ اور قدرتی سائبان نے ہمیں معلموں کے سائبانوں سے بے نیاز رکھا۔ صبح سے عصر تک جبل الرحمۃ پر رہے، بعد ازاں اپنے خیمہ کی طرف اترے۔ اس بابرکت دن کے طیب و طاہر لمحات میں بار بار دارالعلوم حقانیہ کی بقاء و ترقی کے لئے دعائیں کیں۔ دارالعلوم کے تمام متعلقین اراکین کرام معاونین و اساتذہ نظار طلبہ و فضلاء حقانیہ کو دعاؤں میں یاد کیا۔ مزدلفہ اور منیٰ بیت اللہ شریف کے سایۂ یمن و برکت میں جہاں بھی اپنے لئے دعا کی ہے ان تمام کرم فرماؤں کو یاد کیا ہے۔ یہاں پیر کو عرفہ اور منگل کو یوم النحر تھا۔ لاکھوں حاجی چلے گئے، مگر مطاف اور مسعیٰ میں بعینہٖ وہی ہجوم ہے جو پہلے تھا۔ حالانکہ ترک، ایرانی، یمنی، شامی، اردنی، عراقی اکثر چلے گئے ہیں۔ طواف کرنے میں اب بھی بڑی دقت ہوتی ہے۔ بوڑھے اور کمزور تو بمشکل طواف کرتے ہیں۔ حجر اسود کو بوسہ دینا بہت ہی قوی انسان کا کام ہے جو حاجیوں کو دھکیلنا، کمزوروں کو پاؤں میں روندنا معیوب نہ سمجھتا ہو۔ مجھ جیسے کمزور کو بعد از نماز ظہر یا رات کے کسی حصہ میں

حجر اسود کو بوسہ دینے کی سعادت میسر ہو سکتی ہے۔ عجیب حالت ہے روزانہ سینکڑوں لسبیں یہاں سے حاجیوں کی بھری ہوئی نکلتی ہیں۔ مگر فضائے حرم میں وہی بھیڑ ہے جو پہلے تھی۔ امام الحرم الشریف جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور اقامت شروع ہوتی ہے تو پولیس لوگوں کو روکتی ہے کہ صفیں باندھ لو۔ مگر پھر بھی لوگ طواف سے باز نہیں آتے۔ تکبیر تحریمہ ہو جاتی ہے اور لوگ اپنے طواف کو نہیں چھوڑتے۔ ادھر جب امام نماز سے فارغ ہو کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ پڑھتا ہے تو حجر اسود کے قریب بیٹھنے والے فوراً اٹھتے ہیں۔ اور حجر اسود کو بوسہ دینے لگتے ہیں۔ بعض لوگوں کو نماز کا خیال ہی نہیں رہتا دو پولیس والے بیچارے اسی ازدحام کو روکنے کیلئے نماز باجماعت میں شریک نہیں ہو سکے وہ بے چارے حجر اسود کی آغوش میں جماعت کی نماز سے محروم ہو جاتے ہیں۔ غالباً بعد میں اور پولیس آجانے سے ان کو نماز پڑھنے کیلئے رخصت مل جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ عرفہ کے دن تقریباً دس حاجی ہجوم کی وجہ سے فوت ہو گئے ہیں۔ اور منیٰ میں رمی الجمرات کے موقعہ پر ایک دن میں تیس حاجی فوت ہوئے ہیں۔ طواف کرنے والوں میں بھی کل ایک آدمی بے ہوش ہو گیا تھا۔ خدا خبر مر گیا ہے یا نہیں۔ کل ایک بوڑھی عورت ہجوم کی زد میں آکر حجر اسود کے پاس گر پڑی اور اس کی چیخ و پکار پر لوگوں نے اسکو فوراً کھینچا۔ امسال حاجیوں کی تعداد میں بہ نسبت گزشتہ سالوں کے نمایاں اضافہ ہے۔ حکومت کی طرف سے جاری شدہ اعلانیہ میں باہر سے پاسپورٹ پر آنے والوں کی تعداد ۳۱۶۲۲۶ ہے۔ سعودی حکومت کے باشندے اور آس پاس کے شیوخ کی رعایا جنکی تعداد دس لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے، مذکورہ تعداد کے علاوہ ہے۔ گویا باہر سے آنے والے گذشتہ سال کی بہ نسبت ۲۲۱۰۸ زیادہ ہیں۔ اسی طرح مقامی باشندے بھی زیادہ تعداد میں شریک ہوتے ہیں جسکی وجہ موسم کا اعتدال بتایا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ حاجی ترکی ہیں۔ دوسرے درجہ پر ایران اور تیسرے درجہ پر پاکستان ہے۔ ان تینوں ملکوں میں اتحاد و یگانگت اور یہ ترتیب حسن اتفاق ہے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان کے حاجی سب سے زیادہ ہوتے کیونکہ تمام اسلامی ممالک میں یہ بہت بڑی مملکت ہے۔ ترکیوں کی تعداد النشرۃ الخاصۃ باعداد واجناس الحجاج نے ۳۹۳۰۹ بتائی ہے۔ اور ایران ۳۵۳۳۴، پاکستان ۲۳۹۵۱، ہندی ۱۵۸۶۵، افغانستان ۵۸۷۰۔

ایران کی آبادی ڈھائی کروڑ یا کچھ زیادہ ہوگی وہ بھی اکثر شیعہ۔ مگر بہت بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ ترکیوں کی لسبیں سات سو سے زیادہ ہیں۔ اسی طرح ایرانیوں کی لسبیں بھی کافی ہیں۔ مگر ایرانیوں کی کافی تعداد ہوائی جہازوں سے آئی ہے۔ بحری راستہ سے آنے والوں کی تعداد ۱۱۳۳۹۱ ہے۔ اور ہوائی جہازوں سے ۱۰۷۰۷۸ ہے۔ خشکی کے راستہ سے آنے والوں کی تعداد ۹۵۷۵۷ ہے۔

یہ خط میں آپ کو باب السعودی کے بالمقابل مسجد الحرام سے لکھ رہا ہوں لوگوں کے ہجوم، تلاوت و درود اور دعاؤں کی گونج سے پورے طور پر خط لکھنے کیطرف توجہ نہیں ----- بیت اللہ شریف سامنے ہے اور حاجیوں کا بے پناہ ہجوم پروانوں کی طرح اس شمع ربانی کے اردگرد گھوم رہا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ کہ زمین گھوم رہی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ یہاں امتیازی نشانات ختم ہو گئے ہیں۔ رنگین قباؤں والے اور قیمتی کوٹ پتلون والے اسوقت سب ایک ہی لباس میں نظر آرہے ہیں۔ بعض کمزور و ضعیف بوڑھوں اور بوڑھیوں کو اٹھاتے ہوئے طواف کرا رہے ہیں۔ تمام تواضع اور عاجزی سے سرشار ہیں۔ اور خلوص دل سے اپنے گناہوں پر پشیمان ہیں اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اے باری تعالیٰ تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے۔ اور آئندہ کے لئے ہمیں اعمال صالحہ کی توفیق دے۔ ہم عہد کرتے ہیں۔ اور اس بیت کو گواہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہم آپ کی مرضیات کو اپنائیں گے اور تیرے محبوب پیغمبر رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا اتباع کریں گے۔ خدا کرے کہ ان حاجیوں کی یہ دعائیں قبول ہوں اور آئندہ ان کی زندگی قرآن وسنت کے مطابق گذرے۔ ان حاجیوں کے لہجے اور لغات اگرچہ مختلف ہیں، اور ان کے چہروں کے خدوخال اور رنگ میں نمایاں فرق ہے۔ مگر ان تمام کے دل متفق ہیں۔ ہر ایک اپنے کئے ہوئے گناہوں پر پشیمان ہے۔ اشکبار آنکھوں اور لرزاں وترساں دل کے ساتھ رب البیت سے معافی چاہتے ہیں۔ یہ خانۂ خدا کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ یہ خداوند عزّوجل کے مہمان ہیں۔ کوئی ملتزم کے پاس رو رہا ہے۔ اللھم یارب البیت العتیق اعتق رقابنا ورقاب آبائنا وامھاتنا ومشائخنا واحبابنا واخواننا۔ الخ کی فریاد کر رہا ہے۔ کوئی اللھم انی عبدك وابن عبدك واقف تحت بابك ملتزم باعتابك کے کلمات سے خدا کو یاد کر رہا ہے۔ کوئی مقام ابراہیمی میں رو رہا ہے، کوئی حطیم میں، کوئی تلاوت میں مصروف ہے، عجب عالم ہے۔ جہاں بھی نظر پڑے وہاں سے اللہ اللہ کی صدائیں آتی ہیں۔ خداوند قدوس کی رحمت جوش میں ہے۔ فرشتے ان پروانوں کے لئے دست بدعا ہیں۔

ع		ومن دق باب کریم فتح

غار حرا اور غار ثور دونوں کی دید نصیب ہوئی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن انتخاب کو دیکھئے کہ عبادت وریاضت کے لئے غار حرا کی خاموش اور پرسکون جگہ کو منتخب فرمایا جہاں سے بیت اللہ شریف سامنے دکھائی دیتا ہے۔ حضرتؐ دن کو غار کے اندر عبادت وذکر الٰہی میں مصروف رہتے اور رات کو غار کے اوپر والے بڑے پتھر پر بیٹھ کر عجائبات سمٰوات میں تفکر فرماتے۔ اور پناہ کے لئے غار ثور کو منتخب فرمایا۔ جو بلندی میں غار حرا سے سہ گنا زیادہ ہے۔ ساڑھے تیرہ سو سال سے

زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اب تک جانے والا اس کا راستہ بھول جاتا ہے۔ روحانی قوت تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ وہ رات کے آخری حصہ میں وہاں تک گئے اور کچھ دن وہاں رہے وہاں سے بھی بیت اللہ شریف نظر آتا ہے۔ قدیم عرب کا فن سراغ رسانی بھی قابل تعجب ہے کہ وہاں تک کیسے پہنچے۔ حالانکہ پہاڑ کے چاروں طرف ریتلی زمین ہے جہاں قدموں کے نشانات ایک سیکنڈ میں ہوا کی وجہ سے مٹ جاتے ہیں اور پہاڑ پر نشانات اقدام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولد النبیؐ (جہاں اب ایک لائبریری ہے) شعب ابی طالب (جہاں اب ایک بچوں کا سکول ہے) کو دیکھنے گئے۔ جبل ابی قبیس پر چڑھے جہاں مسجد بلال کے نام سے ایک مسجد مشہور ہے۔ مگر درحقیقت یہ مسجد ہلال ہے۔ یہاں لوگ ہلال دیکھنے کیلئے چڑھتے تھے اور بتاتے ہیں کہ معجزہ شق القمر بھی اسی پہاڑی پر رونما ہوا تھا۔

جنت المعلی بھی گئے۔ ام المؤمنین والمؤمنات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی قبر پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ محترم قاری محمد امین صاحب (راولپنڈی) بھی ساتھ تھے۔ ام المؤمنین کا یہ روضہ دروازے کے قریب ہے۔ یہاں نہ کوئی گنبد ہے نہ انکی قبر پر کوئی جھنڈا ہے اور نہ موم بتی جلانے، غلاف اور پھول چڑھانے کی ناجائز رسم ہے۔ سنت نبویؐ کے مطابق ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کی یہ قبور ان لوگوں کو سبق دیتی ہیں۔ جو اپنے آباء و اجداد کی قبروں کو پختہ بناتے ہیں اور ان پر گنبد تعمیر کراتے ہیں۔ غلاف اور جھنڈے نصب کرتے ہیں۔ موم بتیاں اور شمع جلاتے ہیں۔ کمائی کے لئے صندوقچے رکھتے ہیں۔ دروازے کے قریب عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا روضہ بتاتے ہیں۔ ذرا آگے جاکر حضرت رقیہ اور حضرت آمنہ کی قبر ہے اور پہاڑ کے دامن میں ابوطالب عبدالمطلب عبدالمناف کی قبور ہیں۔ جنت المعلی کے دوسرے حصہ میں ابن زبیرؓ اور اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کی قبور ہیں۔ مہاجر مکی حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم کی قبر معلوم نہ ہو سکی۔

لیل النہار اطمینان قلب و مسرت کے ساتھ گذرتے ہیں۔ آج محترم مولانا قاری محمد امین صاحب (راولپنڈی) کے ذریعہ "الحق" مارچ ۱۹۶۷ء کا مطالعہ نصیب ہوا۔ حجاج بیت اللہ کے ذوق و شوق میں اضافہ کرنے والے مضامین کی دید سے وجدانی مسرتیں نصیب ہوئیں، جنکا اظہار نوک قلم سے نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی پُر درد نظم جس نے قلب و روح کے جذبات میں ایک خاص کیفیت پیدا کی۔ محترم قاری صاحب اس عرض احسن کو سنتے رہے اور میں ان کو سناتا رہا۔ کتنا لطف ہے کہ خانہ کعبہ کے سامنے عرض احسن ہو۔ آپ کے اس حسن انتخاب اور ذی الحجہ کے مناسب و موزوں مضامین کو اللہ تعالیٰ قبولیت بخشے۔ آمین ــــــ اس رسالہ سے کتنے لوگوں نے فائدہ حاصل کیا ہوگا۔ ارادہ تھا کہ اس

رسالہ کو رات کے وقت مکمل طور پر مطالعہ کروں گا۔ خاصکر تعلیمی سال کے افتتاح پر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ
نے جو تقریر فرمائی ہے۔ مگر اتفاقاً حاجی شیر افضل خان صاحب بدخشی صدر تعمیری کمیٹی دارالعلوم سے سامنا
ہوا انہوں نے اپنی دلی واردات کا ذکر کیا۔ میں نے کہا الحق میں عرضِ احسن کے نام سے بہترین اور موثر
انداز میں آپ کے دل کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ اور بھی اچھے مضامین ہیں۔ میرا خیال تھا کہ
ان سے یہ رسالہ واپس لوں گا۔ مگر اب تک ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ غالباً وہ مدینہ منورہ چلے
گئے ہیں۔ خلیل الرحمٰن سے بھیجا ہوا مضمون بھی مکمل طور پر نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال رسالہ الحق کی ترقی کا علم ہو کر
از حد خوشی ہوئی۔ دورہ حدیث شریف میں ۱۵۰ طلباء کی شمولیت بھی دارالعلوم حقانیہ کی روز افزوں ترقی
اور مقبولیت کی مبین دلیل ہے۔ رات کو قاری صاحب مولانا محمد کریم افغانی فاضل حقانیہ، مولانا محمد صادق
صاحب فاضل حقانیہ (چلاس) اور بندہ میزاب الرحمۃ کے مقابل بیت اللہ کے سامنے بعد از نماز
مغرب تا نماز عشاء بیٹھے تھے اور اجتماعی طور پر دارالعلوم حقانیہ کیلئے بارگاہِ رب العزت میں دعائیں کیں۔

روداد اردن

اردن کے لیل و نہار میں مجھ پر کیا گزری یہ ایک طویل داستان ہے۔ انشاء اللہ العزیز بیان کروں گا۔
اردن میں کافی کوششیں کی گئیں۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ سے سفر کرنے پر ویزا مل سکتا
ہے، مگر وہ صرف افواہ تھی، پہلے اجازت تھی، مگر بعد میں ممانعت ہو گئی، پھر معلوم ہوا کہ بحری جہاز جارہا
ہے، چنانچہ اس کا ٹکٹ آنے جانے کا خریدا اور عقبہ آیا جو عمان سے ۳۰۰ میل دور وادی سینا کی جانب
ہے وہاں آیا تو ۱۷۰۰ پاکستانی پہلے سے جہاز کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ عقبہ سے ایک میل کے فاصلے
پر ایلہ ہے، جہاں بنی اسرائیل پر مچھلیوں کے شکار کرنے کے جرم میں عذاب آیا تھا۔ وہاں کافی دن انتظار
کے بعد بحری جہاز آیا اور خلیج احمر کے راستہ سے نہر سویز کے بالمقابل ینبوع اور جدہ پہنچے یہ ۱۷۰۰ پاکستانی
جہاز کے انتظار میں کئی دنوں سے پہلے یہاں آئے تھے کمپنی والوں نے ان سے دھوکہ کیا تھا۔ تاریخ یکم فروری
بتائی تھی اور دس تاریخ تک بھی جہاز نہ آیا جب ۲۰ فروری آئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ آپ عربی جانتے
ہیں، آپ یہاں کے مسئول عنہ کو رپورٹ کریں، چنانچہ متصرف البلدیہ کے ہاں گیا اور سب حالات بتائے
انہوں نے عمان کے کمپنی کے مدیر کو اسی وقت ٹیلیفون کیا کہ فوراً ان کا انتظام کر لیا جائے کہ یہ حاجی یہاں
سے چلے جائیں، اس پر انہوں نے وعدہ کیا کہ فوراً ہم باخرہ (بحری جہاز) طلب کرتے ہیں، مگر یہ وعدہ
بھی جھوٹا تھا۔ چند دن گذرنے کے بعد میں بمعہ دو ساتھیوں کے عمان آگیا اور وہاں شاہ حسین بن طلال
ملک عمان کو درخواست پیش کر دی اور وزارت داخلہ کے وزیر ناجم الطل کو بھی۔ استاد خلیفہ عبدالرحمٰن
نے بھی اسکو ٹیلیفون پر کہا تب حکومت نے اس طرف توجہ دی اور سعودی حکومت کو تار دیا کہ فوراً حاجیوں

کو ویزا کی اجازت دے دی جائے اس کے بعد ویزا ملا۔ جہاز آیا اور روانگی ہوئی۔ اسی دوران میں میں جمعہ کی نماز کیلئے پھر بیت المقدس گیا، اس میں خدا کی حکمت تھی، عقبہ کے حاجیوں کی خدمت کرائی — ۱۷۰۰ حاجی تمام دعائیں دیتے ہیں اور اب بھی جہاں ملتے ہیں تو دعائیں دیتے ہیں۔

ایک لمحہ کے لئے پھر مجھے عمان اور عقبہ کی پریشانیوں کی طرف آپ نے توجہ دلائی مگر درحقیقت عقبہ میں جو ایام گزرے ہیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اگر زندگی ہوئی تو انشاء اللہ العزیز آپ کو عمان اور عقبہ کے احباب سے ملاؤں گا۔ وہاں عمان اور عقبہ اریحا میں ایسے دوست اہل علم مل گئے تھے جنکی ملاقاتوں کی وجہ سے سب کچھ بھول گیا تھا۔ مصر کے مشائخ جو مبعوث الازہر ہیں اور وعظ و ارشاد کے امور سرانجام دے رہے ہیں۔ خاص کر شیخ معوض، فلسطینی علماء اور نوجوان طبقہ، کئی کئی کتابیں تحفے کے طور پر وہ دیتے جو میں بوجہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنے دوستوں میں بانٹتا رہا۔ خاصکر مصری علماء کے رسالے اور کتابیں۔ عمان کے ایک بڑے مصنف شیخ معوض جن کی تقاریر پر عمان ریڈیو سے نشر ہوتی ہیں، سے الحق کیلئے کافی مضامین حاصل کئے۔ نماز مغرب اور نماز عشاء کے بعد عقبہ کے اکثر دوست جمع ہوتے اور مجھے مجبور کرتے کہ کسی حدیث شریف یا آیت کریمہ کے متعلق بیان کریں۔ پہلے تو میں کافی عذر و معذرت کرتا مگر وہ مجبور کرتے، آہستہ آہستہ عربی بولنے میں پھر دقت محسوس نہ ہوتی۔

فلسطینی مہاجرین میں دین کا بہت بڑا جذبہ ہے، گھنٹوں تک اگر قرآن و حدیث بیان کی جائے تو وہ سنتے رہیں گے، انہوں نے مجھے واپسی پر عقبہ میں ایک ماہ رہنے کے لئے کہا ہے مگر میں نے ان کو کہا کہ میں دار العلوم حقانیہ جو میرا مادر علمی ہے اس میں ملازم ہوں، میں کیسے یہاں رہ سکتا ہوں۔ اکثر کے دل میں دار العلوم میں پڑھنے کا شوق ہے —— عقبہ کے اس شہر میں آپ عورت کو قطعاً باہر نہیں دیکھیں گے چھوٹی لڑکیاں بھی باہر نہیں نکلتیں۔ ریاطی قبیلہ جو فلسطین میں مشہور قبیلہ ہے، ان لوگوں کی داڑھیاں ہیں۔ ان کی دعوتیں پٹھانوں کی طرح ہیں، بود و باش بعینہٖ پٹھانوں کی طرح، انشاء اللہ تعطیلات کے دوران میں دونوں ان بلاد کی سیاحت کریں گے۔ آپ کی رفاقت ہو اور اس علاقہ کا سفر ہو کتنی خوشی کی بات ہوگی۔

مولانا عبد الغفور صاحب مدنی مدظلہم کی طبیعت آج نسبتاً کچھ اچھی تھی۔ کل میں نے الحق میں شائع شدہ حضرت کی تقاریر جو کراچی میں ہوئیں، حضرت مدظلہ کے فرمان پر سنائیں۔ حضرت کی مجلس میں تیس تک علماء صلحاء موجود تھے اور مشاہیر بھی جن میں ہمارے ملک کے کمشنر فرید اللہ شاہ صاحب بھی شامل تھے۔ دوسری قسط بھی سنائی۔ حضرت مدظلہ رو رہے تھے۔ اخیر میں فرمایا بالکل پورے کا پورا مضمون آگیا ہے۔ رسالہ الحق کو اللہ تعالیٰ ترقی دے کہ مذہبی، تبلیغی کام سرانجام دے سکے۔ رات کو حضرت مدظلہ نے اپنے صاحبزادہ

اور مولانا لطف اللہ صاحب سے کہا کہ دارالعلوم حقانیہ نے میری تقاریر کو جس اہتمام سے شائع کیا ہے، پاکستان بھر میں کسی نے بھی اتنے اہتمام کے ساتھ شائع نہیں کیا، یہ محض حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کی قلبی محبت کا نتیجہ ہے۔ آج انہوں نے مجھے دعوت دی تھی اور دو بجے جب میں گیا تو حضرت شاہ عبداللہ شاہ صاحب (کراچی) سے ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ حضرت کو دارالعلوم حقانیہ سے بے پناہ محبت ہے اور یہ درحقیقت حضرت مولانا عبدالحق صاحب کے خلوص وللہیت کا نتیجہ ہے اور فرمایا کہ دارالعلوم حقانیہ پاکستان بھر میں صحیح معنوں میں علوم دینیہ کی خدمت کر رہا ہے۔ پھر مولانا عبدالحق صاحب (صاحبزادہ حضرت مدظلہ) آئے، انہوں نے کہا کہ رات کو میرے والد صاحب نے آپ کے بارے میں پوری تاکید کی ہے کہ اس کا پورا خیال رکھیں۔ اور فرمایا کہ دارالعلوم حقانیہ کے ساتھ جو عقیدت ومحبت ہمیں ہے وہ اللہ بہتر جانتا ہے، کھانا کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور چائے پلائی، پھر مجھے دو کتابیں ہدیۃً دیں۔ اور ایک کتاب آپ کیلئے ہدیۃً دی۔ اور بخاری شریف کا ایک مصری نسخہ جو چار جلدوں میں ہے، دارالعلوم کیلئے دے دیا اور دیگر کتابوں کے بارے میں کہا کہ میں دوں گا۔

اس بیماری کی حالت میں جب ان کو حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کا سلام پہنچایا گیا اور بیماری کا ذکر کیا، تو رو کر فرمانے لگے کہ "حضرت مولانا عبدالحق صاحب میرے دل ہیں۔ میرا دل بے اختیار ان کو دعائیں دیتا ہے۔ وہ اپنی ہمت سے زیادہ دینی کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت تامہ کاملہ بخشے اور دارالعلوم حقانیہ کی سرپرستی کیلئے ان کی عمر میں برکت عطا فرماوے۔ دارالعلوم کے ارکین، اساتذہ ومعاونین سے مجھے قلبی محبت ہے۔ دارالعلوم حقانیہ پاکستان بھر میں میرا محبوب ادارہ ہے، اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو اور تمام دینی مدارس کو ترقی اور اغیار واشرار کے فتنوں سے ان اسلامی قلعوں کو محفوظ رکھے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہ وحضرت بنوری بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ اسی طرح حرم شریف میں حلب کے مشہور بزرگ شیخ عبدالقادر علیٰ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور اسیطرح یہاں کے ایک ممتاز بزرگ عبدالعزیز بخاری سے بھی۔ ان حضرات سے دارالعلوم کے لئے دعائیں کرائیں۔ ان ہر دو حضرات نے حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کو تسلیمات و دعوات پہنچانے کا فرمایا۔

فقط والسلام

شیر علی شاہ عفی عنہ
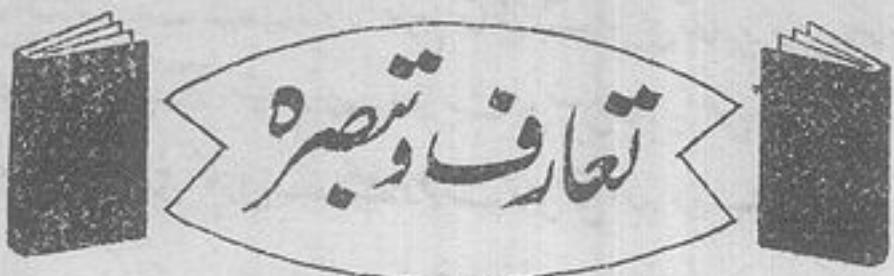
امام اعظم اور علم الحدیث

از مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی صفحات ۸۷۰، قیمت پندرہ روپے، کتابت وطباعت بہترین، کاغذ کرنافلی، ناشر انجمن دار العلوم الشہابیہ، سیالکوٹ۔

امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ النعمانؒ کی محدثانہ شان اور علم حدیث میں انکی عظمت کے موضوع پر اردو زبان میں یہ تحقیقی کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر اتنی سیر حاصل بحث اور تحقیقی مواد غالباً اس سے پہلے پیش نہیں کیا گیا۔ بقول مؤلف محترم کتاب سے مقصود تو امام اعظم کی محدثانہ عظمت وجلالت کو محدثین کی زبانی شاہراہ عام پر لانا تھا۔ لیکن محدثانہ شان کو نکھارنے سے پہلے ضروری تھا کہ علم حدیث کا تاریخی تعارف، اسکی حجیت اور تشریعی حیثیت کو بھی واضح کر دیا جائے، خدا کے فضل سے مؤلف محترم اپنے دونوں مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک طرف حدیث میں امام اعظم کی علمی زندگی کا کوئی گوشہ بغیر تشریح واشارہ کے نہیں چھوڑا تو دوسری طرف علم حدیث کے نازک سے نازک مباحث پر بھی سیر حاصل مواد جمع کیا۔ تدوین حدیث عہد نبوت اور عہد صحابہ میں حدیث کا کتابی ذخیرہ تحدیث روایت میں خلفائے راشدین کا حکیمانہ طریق کار، سنت کی اقسام طرق اور مسانید صحاح وسنن کا باہمی فرق مراتب منکرین حدیث کے شبہات پھر حضرت امام کے سوانح اور حالات علمی کارنامے علم حدیث میں ان کے اساتذہ، جرح وتعدیل رواۃ حدیث، حدیث و قیاس میں تعارض، روایت بالمعنی اور اخبار آحاد وغیرہ میں امام کا طریق کار، معیار، وجوہ ترجیح اور امام اعظم علم حدیث میں امام کے جلیل القدر تلامذہ۔ غرض موضوع سے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا۔ جس عرقریزی، محنت اور تتبع سے کتاب مرتب کی گئی ہے۔ وہ لائق صد تحسین ہے۔ کتاب نہ صرف حضرت امام کے متبعین بلکہ فقہ حنفی اور علوم حدیث سے دلچسپی رکھنے والے ہر طبقہ کیلئے مفید ہے۔ صدیوں سے مخالفین نے علم حدیث اور حضرت امامؒ کے موضوع پر جو شبہات پھیلائے ہیں۔ یہ کتاب ان سب کے خلاف حجۃ قاطعہ اور مجسم جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف جلیل اور ناشر انجمن دار العلوم الشہابیہ کی اس وقیع سنجیدہ علمی خدمت کو قبولیت سے نوازے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اہل علم علماء وفضلاء بالخصوص مدارس عربیہ کے طلباء اور اساتذہ اس کتاب کے مطالعہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔ اور علم وتحقیق

کا کوئی ادارہ اور کتب خانہ اس جلیل القدر کتاب سے محروم نہ رہے۔

المرآۃ لکشف معانی المقامات

از افادات حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی مرحوم
مرتب مولانا حکمت شاہ کاکاخیل ۔ صفحات ۲۹۶۔

ملنے کا پتہ :۔ انوار الاشاعت پشاور ۔ یا ۔ مکتبہ رحیمیہ محلہ جنگی پشاور ۔ (قیمت درج نہیں)

دار العلوم دیوبند کے مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے علوم عربیہ خاص طور سے عربی ادب میں خداداد تبحر اور بصیرت سے نوازا تھا۔ علم ادب کے بعض متداولہ کتب حماسہ، متنبی، پر ان کے شروح وحواشی موجود ہیں۔ زیر نظر کتاب علم وادب میں ابو محمد قاسم بن علی بن عثمان الحریری البصری (م ۵۱۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب مقامات حریری پر مولانا مرحوم کے افادات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے مقاماتِ حریری کیلئے درس کے دوران ارشاد فرمائے، جنہیں حضرت مولانا مرحوم کے بعض تلامذہ نے ان ہی کے الفاظ میں قلمبند کیا۔ فاضل مرتب مولانا حکمت شاہ کاکاخیل (فاضل دیوبند) نے ان املائی تقریروں کو موجودہ کتاب کی شکل دی۔ حضرت شیخ الادب مرحوم نے حسبِ عادت کسی لفظ کی تشریح نہیں چھوڑی اور اسکے متعلق اکثر اور استعارات، مشتقات ومبادی اوزان وجموع اور فقہ اللغۃ کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ بعض مقامات کی تشریح اور ضبط میں کچھ کمی تھی، تو مرتب نے اسکی تلافی کتاب کے دیگر حواشی سے کر دی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اردو زبان میں ہے جو مقاماتِ حریری کے ۲۰ مقالوں پر مشتمل ہے، کتاب کا مطالعہ شائقینِ ادب عربی طلباء مدارسِ عربیہ کیلئے معلومات افزا ثابت ہوگا۔ فاضل مرتب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے درسِ نظامی کی ایک اہم کتاب مقامات پر ایک ممتاز، جید اور صاحبِ بصیرت عالم کے افادات کو محفوظ فرمایا کتاب کی کتابت وطباعت بھی غیر موزوں نہیں ۔ •